سلسلۂ انجمن ترقی اردو نمبر (٦٩)

ترکوں کی اسلامی خدمات
اور
ان کی زبان و ادبیات

پر تین لکچر جو

ڈاکٹر جولیس جرمانس پروفیسر بداپست یونیورسٹی نے
جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن میں دیے -
مترجمہ جناب سید وہاج الدین صاحب بی-اے بی ٹی'
اورنگ آباد کالج

—— :o: ——

سنہ ۱۹۳۲ ع

—— :o: ——

(باہتمام محمد صدیق حسن منیجر انجمن اُردو
پریس - اُردو باغ اورنگ آباد دکن میں چھپ
کر دفتر انجمن ترقی اُردو سے شائع ہوی)

تعداد طبع ۱۰۰۰ قیمت فی جلد ڈیڑھ روپیہ

قواعد و ضوابط انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

(۱) سرپرست وہ ھیں جو پانچ ھزار روپے یک مشت یا پانسو روپے سالانہ انجمن کو عطا فرمائیں —

(ان کو تمام مطبوعات انجمن بلا قیمت اعلیٰ قسم کی جلد کے ساتھہ پیش کی جائیں گی)

(۲) معاون وہ ھیں جو ایک ھزار روپے یک مشت یا سالانہ سو روپے عطا فرمائیں - (انجمن کی تمام مطبوعات ان کو بلا قیمت دی جائیں گی)

(۳) رکن مدامی وہ ھیں جو ڈھائی سو روپے یک مشت عطا فرمائیں —

ان کو تمام مطبوعات انجمن مجلد نصف قیمت پر دی جائیں گی

(۴) رکن معمولی انجمن کے مطبوعات کے مستقل خریدار ھیں جو اس بات کی اجازت دے دیں کہ انجمن کی مطبوعات طبع ھوتے ھی بغیر دریافت کئے بذریعۂ قیمت طلب پارسل ان کی خدمت میں بھیج دی جائیں - (ان صاحبوں کو تمام مطبوعات پچیس فی صدی قیمت کم کرکے دی جائیں گی) مطبوعات میں انجمن کے رسالے بھی شامل ھوں —

(۵) انجمن کی شاخیں وہ ھیں جو انجمن کو یک مشت سو١-و روپے یا بارہ روپے سالانہ دیں (انجمن ان کو اپنی مطبوعات نصف قیمت پر دے گی)

ترکوں کی اسلامی خدمات

ڈاکٹر جولیس جرمانس بدا پسٹ یونیورسٹی (هنگری) میں اسلامی علوم کے پروفیسر هیں - کچهه عرصه هوا ریاست حیدرآباد دکن کی طرف سے ڈاکٹر سر رابندرا ناتهه ٹیگور کی درخواست پر ان کی یونیورسٹی شانتی نکیتن میں اسلامیات کی ایک پروفیسری' نظام الملک چهر کے نام سے قائم کی گئی تهی - ڈاکٹر صاحب موصوف کی خدمات تین سال کے لئے سررابندرا ناتهه ٹهگور نے اپنی یونیورسٹی کے لئے مستعار لی تهیں - ڈاکٹر صاحب ترکی اور عربی زبانوں کے عالم اور اسلامی تهذیب و تمدن اور مذهب کے ماهر اور دلدادہ هیں بلکه یوں کہنا چاهئے که اچهے خاصے مسلمان هیں —

جامعۂ عثمانیه کی درخواست پر انهوں نے ترکوں کی اسلامی خدمت اور ان کی زبان و ادب پر تین توسیعی لکچر دئے — پهلا لکچر ترکوں کی تاریخی عظمت و اهمیت پر هے اور باقی دو لسانی تحقیق اور ان کے ادبی کارناموں کے متعلق هیں —

پروفیسر صاحب موصوف کی نظر اس مبحث میں بہت وسیع اور غائر هے اور انهوں نے ترکوں کے تمدن اور ان کی زبان اور ادب کی کیفیت اس دلاویزی اور جامعیت کے ساتهه بیان فرمائی هے که متعدد کتابوں کے پڑهنے کے بعد بهی یه بات حاصل نہیں هوسکتی - یه گویا ڈاکٹر صاحب کے وسیع مطالعه اور ایک مدت کے غور و خوض کا نچوڑ هیں —

هم ڈاکٹر جرمانس صاحب کے نہایت ممنون ہیں کہ انہوں نے اپنی خاص عنایت سے ان لکچروں کا اردو ترجمہ شایع کرنے کی اجازت دی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ ملک کا اردو داں طبقہ ان عالمانہ اور دلچسپ لکچروں کو بہت شوق سے مطالعہ کرے گا اور ان معلومات سے مستفید ہوگا جو انہیں اردو میں تو کیا کسی دوسری زبان میں بھی اس طرح یکجا نہیں ملیں گی —

عبدالحق

سکریٹری انجمن ترقی اردو اورنگ آباد ۔ دکن

وسط ایشیا کا بے آب وگیاہ کوہستان جو ہمیشہ سے خانہ بدوش اقوام کی جولان گاہ رہا ہے، غالباً ان نسلوں کا بھی اصلی وطن ہے جنہیں اگرچہ ہم عام طور پر 'ترک' کہتے ہیں، لیکن جو نسلی خد و خال اور عادات زندگی نیز اشتراک زبان کے اعتبار سے منگولوں سے بہت قریبی تعلق رکھتے ہیں، ان ترکوں کی تاریخ تحریری دستاویزات سے بھی قدیم تر ہے - اور انسانیاتی (Anthropological) اور لسانیاتی (Linguistic) حیثیت سے نسلوں کی جو تقسیم اور درجہ بندی کی گئی ہے، اس سے بھی بہت پہلے ان کا اثر ایشیا کی تاریخ میں نظر آتا ہے ۔۔ چینی زبان کے تاریخی وقائع میں، ہمیں ان کا ذکر سنہ ۱۲۰۰ قبل مسیح میں ملتا ہے، اور دوسری صدی قبل مسیح ہی میں، ہمیں ان کے گروہ چین کی شمالی سرحد پر تاخت و تاراج کرتے نظر آتے ہیں، جو گویا ان کی آیندہ تاریخ کا پیش خیمہ

تھا - یہ " ھیونگ نو " (Hiung - Nu) ' جو غالباً آگے چل کر از منۂ وسطیٰ میں ھن (Huns) کہلائے ' اور " یوئن یو ئن " (Yuen Yuen) جو شاید بعد میں " اوار " (Avar) اور تو کیو (Tu-kiu) کے ناموں سے معروف ہوئے ' جنگجو قبیلے تھے ' جو آپس میں متحد ہو کر کسی طاقتور سردار کی ماتحتی میں ' بیگانوں اور یگانوں دونوں کے خلاف لوٹ مار کیا کرتے تھے - اس زمانہ میں ان کے گروہوں میں کسی طرح کا قومی یا نسلی احساس موجود نہ تھا ' بلکہ ان من چلوں کی صفوں میں اکثر غیر ترکی عناصر بھی موجود رہا کرتے تھے ' اور ان کے دوش بدوش لڑتے تھے - چونکہ پاستانیوں کی طرح سے از منۂ وسطیٰ کے باشندوں کے کان بھی باریک لسانیاتی فرقوں سے آشنا نہ تھے ' بلکہ وہ صرف دوسروں کے مسلک زندگی اور عادات و خصائل ھی پر توجہ کرتے اور انھی کی بنا پر ان کے نام مقرر کرتے تھے ' اس لئے ' بجائے اس کے کہ وہ لسانیاتی نقطۂ نگاہ سے ان قبیلوں کا کوئی نام تجویز کرتے ' انھوں نے انھیں " سی تھی ین " (Scythians) یا " ھیونگ - نو " (Huing - nu) یا " ترک " کہا - ان قبائل کی کوئی مشترک زبان نہ تھی - " یورالی " (Uralian) . " ایرانی " " منگولی " تینوں زبانیں ان کے جرگوں میں بولی جاتی تھیں - لیکن ان کی داخلی تنظیم ' اور ان کا ابتدائی مسلک آتش پرستی جس نے رفتہ رفتہ " شامانیت * (Shamanism) " بدھ مت "

---

* ایک مذھبی فرقہ ھے ' جس میں سحر پرستی اور ارواح پرستی کی جاتی ھے ' یہ اب بھی وسطی اور مغربی ایشیا کے بعض حصوں میں پایا جاتا ھے - شامان روح اعلی ھے ' جس کے تابع دوسری ارواح خبیثہ ہوتی ھیں ۱۲ - مترجم

اور بعد کو "مسیحیت" اور اسلام کی شکل اختیار کی، علاوہ بریں ان کی نسلوں میں نئے خون کی آمیزش اور پھر ان کی مخصوص خانہ بدوشی کی زندگی - یہ سب باتیں ان میں اور ایرانی آباد کاروں، چین کے چاول بونے والوں، ہندوؤں، اور یورپ کے مسیحی آریاؤں کے درمیان مابہ الامتیاز تھیں - ان کی اس داخلی تنظیم کو، جس کا مرکز ایک ایسا سردار ہوتا تھا جو اپنے ماتحت متعدد قبائل پر مطلق العنانی کے ساتھ حکومت کرتا تھا، اور جس کی معاشی اور سیاسی حیثیت صرف یہ تھی کہ یہ لوگ زرخیز خطوں کی رعایا پر تصرف اور غلبہ حاصل کرکے انھیں تو صنعت و حرفت کے پر سکون مشاغل سپرد کر دیتے تھے اور خود اپنی توجہ تمامتر انتظامی امور پر مبذول کرتے تھے، ہم تورانی تنظیم کہہ سکتے ہیں - واضح رہے کہ یہ لفظ تورانی کسی لسانیاتی مفہوم پر دلالت نہیں کرتا، اس لئے کہ اس اصطلاح میں اکثر یورل الطائی (Ural - Altain) اور آرین باشندے بھی داخل تھے، بلکہ ایرانیوں، اور ان مستقل زندگی بسر کرنے والے شہری باشندوں کے بالمقابل جو اپنا ایک الگ مسلک، اپنی علیحدہ دینیات اور اپنی ایک مخصوص معاشرتی تنظیم رکھتے تھے، تورانیوں کی اصطلاح ان خانہ بدوش جرگوں پر حاوی ہے جو ہمیشہ ایک مرکز پر مجتمع ہوتے، پھر بکھرتے، پھر جمع ہوتے رہتے تھے، اور جن کا اپنا کوئی خاص تمدن نہ تھا، بلکہ جن باشندوں سے ان کا سابقہ رہتا تھا ان کے اجزائے تمدن کا ایک خاصہ معجون مرکب تھا - حکمران طبقہ کی زبان عموماً ترکی ہوتی تھی - گمان غالب یہ ہے کہ آتیلا * (Attila)

---

* ہنوں کی جماعت کا سردار، پانچویں صدی عیسوی میں گزرا ہے، یہ لوٹ مار کرتا ہوا جرمنی اور فرانس تک پہونچ گیا تھا - ۱۲ - مترجم

بیان (Bayan) ' بلکہ شاید چنگیز خان کی مادری زبان بھی ترکی ھی تھی - اس کا ایک ثبوت یہ ھے کہ ان کے تمدن کے جو چند تحریری آثار آج تک موجود ھیں ' مثلاً وی اینا (Vienna) کے عجائب خانہ میں 'اتیلا' کے سونے کے ظروف وغیرہ ' ان پر ترکی کتبے موجود ھیں ' اس کے علاوہ ' " اور خان " (Orkhan) اور ' ینی سی ' (Yenisey) کے کتبوں کی زبان بھی ترکی ھی ھے —

اپنی اسی حد درجہ بے چین اور سیال معاشرت ھی کی بدولت تورانی حدود چین سے لیکر مشرقی یورپ تک دھاوے مارتے رھتے تھے ' اور چونکہ اثر قبولیت بھی ان کی معاشرتی خصوصیت خاصہ تھی ' اس لئے انھوں نے تمام تمدنوں کا رنگ قبول کیا - نسطوری مسیحیت اور ایرانی مجوسیت کو چین تک پہونچانے والے یہی لوگ تھے ' خشکی کے راستہ چین اور ھندوستان کے درمیان آمد ورفت کا سلسلہ بھی انھی کی بدولت قائم ھوا ' اور آگے چل کر سر زمین یورپ میں اسلام کا بیج بونے والے بھی یہی ھوے —

ولادت مبارک آنحضرت صلعم کے زمانے میں یہ لوگ ' بازنطین ' (Byzantium) کو ' چین ' کے ریشم کی بر آمد کیا کرتے تھے ' اور اسی تجارت کی وجہ سے ان میں اور ایرانیوں میں تصادم ھوا ' انھوں نے ' بازنطین ' اور ' حبش ' کے ساتھ سمجھوتا کرلیا - کتنی حیرت انگیز بات ھے کہ ' جاپان ' کے قدیم ترین بودھ مت کے مندر میں ایرانی اشیاء موجود ھیں ' جنھیں ایشیاء پار لانے والے یقیناً یہی ترکی کاروان ھوں گے —

تورانیوں کی ریاستوں کی بنیاد ھمیشہ شخصی نفوذ اور سطوت پر ھوا کرتی تھی - چونکہ ان کے گروھوں میں دو براعظموں کے باشندے داخل تھے ' اس لئے انھوں نے کبھی بھی کوئی قومی شکل اختیار نہیں کی - لیکن اگر

کوئی الوالعزم شخصیت نظر آجاتی تو اس کی اطاعت یہ لوگ دل و جان سے کرتے ' اس کی ساتھتی میں ایک مرکز پر جمع ھوجاتے - اور ایک جری ' اور جوال ' اصول حرب کی ماھر ھستی کا خیمہ ھی سلطنتوں کا محور بن جاتا ۔ ترک اطاعت اور قیادت دونوں کے گروں سے بخوبی واقف تھے ' اور ایک باعزیمت ھستی کی کشش بات کی بات میں لاکھوں ترکوں کو مطیع اور فرمابردار بنادیتی تھی - تورانی سلطنت کے انمل بے جوڑ عناصر کی شیرازہ بندی کرنے والی ھمیشہ کسی ایسے ھی صاحب قوت و ارادہ فرد کی ذات ھوا کرتی تھی ' اور جب کبھی اس شخصیت کا اثر مٹتا یا کوئی دوسری قوی تر شخصیت اس کی مد مقابل ھو جاتی ' تو سلطنتیں جس آسانی سے بنی تھیں اسی سرعت کے ساتھہ متزلزل ھو جاتیں ' اور ان کی بنیادوں پر دوسری سلطنتیں قائم ھو جاتیں - تورانیوں کے مزاج پر ان کے مخصوص جغرافی طبعی حالات اور ان کی تاریخ کے نقوش اتنے گہرے بیٹھے ھیں کہ آسانی سے مٹ نہیں سکتے - چنانچہ آپ ان کی صدیوں کی تاریخ پڑھ جائیے ' آپ یہی دیکھیں گے کہ تورانی باشندوں کی سیاسی تشکیل ھمیشہ ایک سی رھی ھے ' یعنی مخوت آبادی پر مسلم معسکر کی حکومت ' اور اس حکومت سے ھمیشہ ایک مرکب تمدن پیدا ھوا ھے ' جو بجائے اس کے کہ قوم سے منسوب ھو ' بانی خاندان کے نام سے معروف ھے ۔ واقعہ یہ ھے کہ تورانی اقوام ھمیشہ بڑی بڑی شخصیتوں کے ناموں سے معروف رھی ھیں —

تورانی نوجوان ھمیشہ ایک زبردست " شخصیت " پیدا کرنے کے خواب دیکھا کرتا تھا - واضح رھے کہ شخصیت کا مفہوم ان کے یہاں ھندوؤں کی طرح سے گیان دھیان کرنے والی اور مادی دنیا کو تج کر ذات مطلق میں

ضم ہو جانیوالی ذات کا نہ تھا ' شخصیت سے مراد ان کے یہاں ' جنگجویانہ فعالیت ہوا کرتی تھی : یعنی فتح وتسخیر ' حکومت ' عمل ' اور اگر سیاسیات بھی ایک طرح کی فعالیت ہی ہے ' تو ماننا پڑے گا کہ ترک پیدائشی سیاست دان تھے ' اور ایک اکیلی ان کی قوم نے جتنی سلطنتوں کو مٹایا اور قائم کیا ہے ' اس کی نظیر دنیا کی کوئی اور سلطنت نہیں پیش کرسکتی ۔ مثلاً ' سلجوقوں ہی کو دیکھہ لیجئے کہ وہ ایک غیر معروف خاندان کی حیثیت سے منصہ شہود پر آتے ہیں اور اپنی خوش بختی اور جانبازی کی بدولت تین سلطنتوں کو اپنے زیرنگیں کرلیتے ہیں۔ اور پھر ان کی مثال کو سامنے رکھکر ایک اور ترکی قبیلہ یعنی ' غزنویہ ' ہندوستان میں اپنی سلطنت کا پایہ رکھتا ہے ۔ ترکی سورما ہمیشہ ہر بطال اعظم کی صدا پر لبیک کہنے کے لئے تیار رہتے تھے ' اور اگرچہ انہوں نے ' ایران ' ' شام ' ' ایشیاے کوچک ' ہندوستان ہر جگہ اپنی سلطنتیں قائم کیں ' لیکن اپنی قومیت کی طرف سے انہوں نے اتنی بیگانہ منشی برتی کہ ایرانی تمدن کو اختیار کرلیا اور ایرانی المذاق بن گئے کیا بوالعجبی ہے کہ ' شاہ نامہ جس میں تورانیوں کے مقابلہ میں ان کے حریف ایرانیوں کے رزمیہ کارناموں کو زندہ جاوید بنایا گیا ہے ' ایک ترکی النسل بادشاہ کی سرپرستی میں لکھا جاتا ہے ' اور ایشیاے کوچک کے سلجوق بادشاہوں کے محلوں میں فارسی کے اشعار آبدار کندہ نظر آتے ہیں !

یہ سلجوق ترکوں ہی کا کارنامہ ہے انہوں نے شام کے صلیبی مبارزوں کے مقابلہ میں عباسیہ کی زوال آمادہ سلطنت کو سنبھالے رکھا ' اور ایشیاے کوچک

میں سلطنت قائم کی ' جس نے دو سو سال سے زیادہ عرصہ تک اسلامی تمدن کے بیج وہاں بوئے - " قونیہ " میں (جس کا قدیم نام " آئی کونی " یم تھا) " سینٹ پال کے غاروں سے صرف چند ہی میل کے فاصلہ پر ایک سبز گنبد کے نیچے ' ایران کے بزرگ ترین شاعروں میں سے ایک شاعر - یعنی " مولانا جلال الدین رومی (رح) " دفن ہیں - سلجوقوں کے مدرسے اور محل ' جن کا طرز تعمیر ایرانی ہے ' اور بازنطینی یونانی فن تعمیر کی آمیزش لئے ہوے ہے ' آج تک ان کے اعلیٰ اور شستہ مذاق اور علم و فن کی سر پرستی کی یاد تازہ کئے ہوے ہیں —

بازنطینی سلطنت ' جو مشرق میں مسیحیت کا بعید ترین ناکہ تھی ' فرقہ وارانہ جنگوں کی بلا میں گرفتار اور ایسی بد نظمی کا شکار تھی جس کی نظیر مشکل سے ملے گی جبری محصولوں ' دربار کی عیاشیوں اور سفارش گردیوں * نے اس سلطنت کی ' جس کا شمار کسی زمانے میں دنیا کی عظیم ترین سلطنتوں میں ہوتا تھا ' ساری قوتوں کو چوس لیا تھا ' اور اگر یہہ اپنی سخت جانی سے ایک مدت دراز تک سنبھالے لیتی رہی ' تو اس کی وجہ یہہ نہ سمجھنا کہ اس میں اندرونی طور پر کچھہ جان باقی تھی ' بلکہ صرف رعایا کا جمود ' اور بعض جنگ جو قیصروں کی عارضی کوششیں اس کے ڈھچر کو سنبھالے ہوے تھیں - اس کا انجام بد یقینی تھا ' اور اس کے زرخیز علاقے اور بد دل باشندے خدا سے چاہتے تھے کہ کوئی فاتح آے اور ملک میں نظم و نسق

---

* ہم نے یہہ ترجمہ انگریزی لفظ Favouritism کا کیا ہے ' شاید سند قبول حاصل کرے ۱۲ مترجم —

اور ضبط قائم کرے —

منگولوں کے حملہ کی آندھی نے ' جو اسی قسم کی اور آندھیوں کی طرح ' " چین " کے حدود سے اُٹھی ' اور کوہ " ایلپس " تک بڑھتی چلی گئی ' سارے " ایشیا " کو تہ و بالا کر ڈالا ' کچھہ قومیں تو بالکل هی نیست و نابود هوگئیں ' بعضوں کے پاؤں اکھڑ گئے ' ترکوں کے چھوٹے چھوٹے جرگے بھی ' جن کا تعلق " کے خان " (Kay khan) کے قبیلہ سے تھا ' اسی کی رو میں " کوہ قاف " کے پار ایشیاے کوچک تک پہونچ گئے ' یہاں پہونچکر انھوں نے " علاؤالدین کیقباد " سلجوق کے دربار میں پناہ لی ' جس نے ان کی خدمات کے صلہ میں انھیں " انگورہ " کے پاس متوطن هونے کی اجازت دیدی - مزید خدمات کے معاوضہ میں ' ان کی جاگیروں میں اضافہ کیا گیا ' جو ایشیاے کوچک کے مغرب رخ واقع تھیں - " اناطولیہ " میں ' سلجوقیوں کی سلطنت کی آخری ساعت آن لگی تھی - جب منگولوں نے تازہ دم هو کر اس پر دوبارہ تاخت شروع کی ' تو ماتحت امرا اور جاگیرداروں نے سلطنت کا ساتھہ نہ دیا ' بلکہ اس تاک میں رہے کہ موقع ملتے هی کچھہ علاقہ دبا بیٹھیں ۔ " کے خان لی " ترکوں نے بھی ایشیاے کوچک کے شمال مغربی ساحل پر یونانیوں کے کچھہ قلعے تسخیر کر لئے ' اور کمال هوشیاری کے ساتھہ بعض مقامی عیسائی جاگیرداروں کے ساتھہ ساز باز کر کے " عین گل " " بلے جیک " اور " یار حصار " پر قبضہ کر لیا - رفتہ رفتہ " کے خان لی " قبیلہ کا شمار زوال آمادہ سلجوقی سلطنت کے زبردست ترین جاگیرداروں میں هونے لگا —

اپنے پیش رووں کی طرح ' جلجوں نے ایشیاے کوچک میں بود و باش

اختیار کرلی تھی ' " کے خان لی " بھی ترک ھی تھے ' البتہ ان کی بولی ذرا اُن سے مختلف تھی - ایک اور فرق یہہ تھا کہ سلاجقہ تو صدیوں سے اسلام لا چکے تھے ' لیکن یہہ نووارد ھنوز اپنے قدیم ' خانہ بدوشی کے زمانہ کے ' مسلک پر قائم تھے . ان کے سردار " ار طغرل " کے بیٹے " عثمان " کی شادی کے متعلق جو روایت مشہور ھے ' اس سے ھمارا یہہ قیاس حق بجانب ھے کہ انھوں نے ایشیاے کوچک کی اسلامی فضا میں داخل ھونے کے بعد اسلام قبول کیا - " عثمان " نے سنہ ۱۳۰۰ ع میں سلجوقی سلطنت کے جوے کو اتار پھینکا ' اور یونانیوں کو پسپا کرتا ھوا آگے بڑھا ' سنہ ۱۳۲۶ ع میں اس کا انتقال ھوا ' اور اس وقت اس کی سلطنت کی حدود جنوب میں " قتیبھہ " شمال میں بحر " مار مورہ " اور " سقاریہ " اور " ادرانوس " کی وادیوں تک پھیلی ھوئی تھیں ' اور اس کی ساری قلمرو میں نظم و نسق بخوبی قائم ھو چکا تھا —

سلجوقیوں کے زوال کے بعد ' " قرامان اوغلو " ان کی مملکت کا وارث جائز بن بیٹھا تھا ' لیکن متعدد جاگیرداروں نے اس کی شہنشاھیت کو تسلیم نہیں کیا ' اور خود مختار ھوگئے - " اے دین " .. سارو خاں " " منتشہ " " قرسیاں " اور کئی دوسرے باجگزار امیروں نے اپنے اپنے علاقوں میں اپنے الگ دربار جما لئے تھے ' وادیوں میں ترکمان قبائل گشت کرتے پھرتے تھے - چونکہ " عثمان لی " خاندان نے عروج پاکر شمال مغرب میں اپنی بنیادیں مستحکم کرلی تھیں ' اس لئے جغرافی محل وقوع کے اعتبار سے اسے اپنے دوسرے حریف قبائل پر تفوق حاصل تھا ' جو فوجی قوت کے اعتبار سے اس سے بڑھے ھوے تھے - " قرامان لیون " کا راستہ سمندر کی طرف بند تھا ' اور چونکہ وہ گرد و پیش حریفوں میں گھرے

ہوے تھے ' اس لئے ان کی حدود میں توسیع کی گنجائش نہ تھی ' باقی رہے ' " آیدین " " منتشہ " اور " قرمیان " کے قبائل ' تو ان کا محل وقوع سمندر کے بالکل نزدیک تھا ' اور اگر وہ ادھر ادھر ہاتھہ بڑھاتے ' تو یونانی مبارزین ان کی تعزیر کے لئے موجود تھے - " عثمانی " یا " عثمان لی " جو دوسرے ترکوں کی طرح سے' آئندہ اپنے بہادر سردار (عثمان) کے نام سے موسوم ہوے ' اناطولیہ کے زرخیز ترین علاقوں میں آباد تھے' اور بازنطینی سلطنت کے دارالسلطنت کے پڑوس ھی میں تھے - یورپ کے صوبہجات تک ان کی رسائی بہت آسان تھی ' جہاں کی رعایا حکومت کے جبر و تعدی سے اس حد تک عاجز آگئی تھی کہ اب نہ تو ان میں مقاومت کی تاب ھی تھی ' اور نہ اس کا کوئی خیال - ' عثمان ' اور اس کے جانشین ' اورخان ' اور ' مراد ' اگر چاہتے تو لالچ میں آکر ایشیائے کوچک کو بہت آسانی کے ساتھہ فتح کرلیتے اور سلجوقی سلطنت کے وارث بن سکتے تھے ' لیکن اس پالسی کا نتیجہ یہ ہوتا کہ انھیں اپنے حریفوں کے ساتھہ تباہ کن لڑائیاں لڑنی پڑتیں ' اور چونکہ ان کے پاس مشرق اور جنوب میں فوجی نقل و حرکت کے لئے کوئی مرکز نہ تھا ' اور نہ کوئی بیڑہ تھا ' اس لئے بازو کی طرف سے آکر ایجین (Aegian) ترک انھیں گھیر لیتے ' غرض کہ یہ پالسی عثمانی خاندان کے حق میں پیام مرگ ثابت ہوتی - سلجوقیوں کے دارالسلطنت کا محل و قوع ' یعنی ایک طرف بحیرہ ' مارمورا ' اور دوسری طرف وسط ' اناطولیہ' کا کوہستان - ایسا تھا کہ اگر کوئی اسے فتح کرنا چاہتا تو اسے چکر کاٹ کر آنا پڑتا - غرض کہ مشرق کی طرف کے حریفوں سے بے خدشہ ہوکر' عثمان لیون نے بلقان کو اپنی تگ وتاز کا مرکز قرار دیا - بہت پہلے ھی ' یعنی سنہ ۱۳۶۶ ع میں ' وہ دھاوے مارتے اور لوٹ مار کرتے ہوئے دریائے ڈینیوب ' کے نشیبی حصہ تک پہونچ چکے تھے اور ' لوی آت آن زو ' کو

اس بری طرح شکست دے چکے تھے کہ وہ بمشکل اپنی جان سلامت لیکر بھاگ سکا تھا - 'فلپا پولس' اور 'ادرنہ' اس سے بھی چند سال پہلے * ان کے ھاتھہ میں آچکے تھے —

'بروسا' صرف چالیس سال تک اس نوخیز سلطنت کا دارالخلافہ رہا' اور اس کے بعد مرکز ثقل جزیرہ نمائے بلقان کی طرف منتقل کردیا گیا جہاں 'ادر نہ' ان کا دارالخلافہ قرار پایا - اس کار روائی نے 'یورپ' کو سراسیمہ کردیا' اور وہ بد حواس ہوکر عثمانیوں کو نکالنے کے لئے فوجیں جمع کرنے لگا' لیکن دوسری طرف ان کے ایشیائی حریفوں کو اس کا گمان بھی نہ تھا کہ یہ (ترک) آئندہ چل کر ان کے حق میں کتنے خطرناک ثابت ہوں گے' اور وہ ان کی طرف سے بالکل مطمئن تھے" - یہاں تک کہ سنہ ۱۴۵۳ ء میں 'قسطنطنیہ فتح کرنے کے بعد' 'سلطان محمد فاتح' نے اپنی ظفر یاب عساکر کی عنان اناطولی حکمرانوں کی طرف بھی پھیر دی —

عثمانی فتح و ظفر کا یہ سیلاب بے مزاحمت برابر آگے بڑھتا گیا سنہ ۱۴۹۲ ع میں انہوں نے 'اسٹیریا' + (Styria) کو تاخت و تاراج کیا' اور اس طرح اگر ایک طرف 'اندلس میں اسلام کا آخری مرکز' مسلمانوں کے قبضہ سے نکلا' تو دوسری طرف اسی زمانے میں ترکوں نے اپنی فتوحات سے اس کی بخوبی تلافی کر دی - ادھر 'اندلس' میں مور جنگ 'توورز' (Tours) میں ہزیمت اٹھانے کے بعد 'ہسپانیہ' کے قصبوں میں منتشر

---

* 'سلطان مراد اول' نے 'ادرنہ' سنہ ۱۳۹۱ع میں تسخیر کیا تھا اور سنہ ۱۴۵۳ع میں فتح 'قسطنطنیہ' کے زمانے تک یہی مقام ترکوں کا دارالخلافہ رہا — ۱۲ - مترجم -

+ یہ سلطنت آسٹریا کا ایک صوبہ تھا - ۱۲ مترجم -

ہوکر اسلامی تعلیم کے فروغ و نشو و نما میں مشغول تھے ، ادھر مشرق میں یورپ کا نیا دشمن ، یلغار کرتا ہوا 'وی اینا' (Vienna) کے دروازوں ، بحیرۂ اوقیانوس اور بحیرہ اسود کے شمالی سواحل تک بڑھ گیا تھا ، خصوصاً 'فتح مصر' کے بعد تو ترکی سلاطین کے کلاہ تفاخر میں "خادم الحرمین الشریفین" کا طرۂ امتیاز بھی لگ چکا تھا - غرض کہ دو صدی کے اندر اندر ، ایک چھوٹے سے دیہاتی قبیلہ نے یہ عروج حاصل کیا کہ اب اس کا شمار دول عالم میں ہونے لگا تھا ، اور اس کی سلطنت اپنی وسعت ، قدرتی وسائل کی مالا مالی اور تمدن کی بوقلمونی کے اعتبار سے تاریخ عالم کی بزرگ ترین سلطنتوں کی ہم پایہ بن چکی تھی - اگرچہ مذہبی اور تمدنی حیثیت سے سلطنت ترکی اسلامی تھی ، لیکن وسط ایشیا کے علف زاروں کی ساری خو بو اس میں موجود تھی - اس کی رعایا میں یونانی ، کرد ، ایرانی ، عرب ، البانی ، سلافی ، ہنگری ، جرمن غرض کہ سب ہی ملکوں اور ملتوں کے باشندے داخل تھے - ترک کا نام ہی ہیبت پیدا کردینے کے لئے کافی تھا ، اور انہیں شکست دینا یا ان کی قوت کو تباہ کرنا ایک ناممکن امر سمجھا جاتا تھا - لیکن جو چیز انسانی کوششوں کے لئے امر محال تھی ، زمانہ کے ہاتھوں پوری ہوکر رہی ، امتداد زمانہ اور تورانی نظام حکومت کی اندرونی خامیاں ترکوں کی قوت کو توڑ کر رہیں - سنہ ۱۶۰۰ ع وہ زمانہ تھا جب کہ عثمانی شوکت و عظمت کا آفتاب نصف النہار پر تھا ، لیکن ایک صدی بعد ہی اس کا زوال شروع ہوگیا تھا - 'ہنگری' کے صوبجات ان کے قبضہ سے نکل چکے تھے ، اور اس کے بعد سے جلد جلد اور پے درپے ناکامیوں اور ہزیمتوں کا سلسلہ کچھ اس طرح شروع ہوا کہ بدنصیب ترکی جنرلوں کی نالایقی کو موردالزام ٹھہرانا ، یا دشمنوں کی اعلیٰ قابلیت

اور حسن تدبیر کو اس کا سبب قرار دینا درست نہیں معلوم ہوتا ، بلکہ ماننا پڑتا ہے کہ اصل میں یہ مرض نظام سلطنت کا تھا ، جس کی معاشرت ، طرز حکومت ، اور اصلی روح کو گھن لگ گیا تھا ۔ چونکہ ہم ایک ایسی سلطنت سے بحث کر رہے ہیں جو یورپ کی دشمن تھی ، اس لئے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ کون سے اسباب تھے ، جنھوں نے عثمانیوں کے مقابلہ میں یورپ کو ضعیف کردیا تھا ، اور پھر کون سے اسباب اٹھارویں انیسویں صدی عیسوی میں اس کے (یورپ) از سر نو عروج کے محرک ہوے —

یورپ کے ضعف کے اسباب کچھہ داخلی تھے ، اور کچھہ خارجی ۔ اپنے عروج کے زمانہ میں ترکوں نے جن قوموں سے لڑائیاں لڑیں ، ان کے مقابلہ میں خود ان کا (ترکوں کا) محل وقوع حربی نقطہ نگاہ سے بہت بہتر اور مفید مطلب تھا ، اور پھر ان قوموں کی سلطنت کے کل پرزے بالکل فرسودہ ہو چکے تھے ، اور وہ مساوی تعداد کی فوجوں سے بھی ، ترکوں کی زیادہ مسلح اور زیادہ جوشیلی سپاہ کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے ۔ مسیحی یورپ آپس کے نفاق کا شکار بنا ہوا تھا ۔ بلقان کی چھوٹی چھوٹی ہمسایہ سلطنتیں ایک دوسرے پر خار کھاتی تھیں ، اور جب کبھی ان کی متحدہ فوجیں میدان جنگ میں ترکوں کے مقابلہ کے لئے اتریں ، تو کئی مرتبہ بری طرح سے شکست کھائی ۔ حد تھی کہ سارا یورپ چالیس ہزار باقاعدہ فوج بھی ترکوں کے مقابلہ کے لئے میدان میں نہ لاسکتا تھا ، جن کی جانثاری افواج کے متعلق یہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ ان سے بڑھکر میدان کا دھنی یورپ میں اور کوئی نہیں ہے ۔ یورپ کے جاگیری نظام نے سلطنتوں کی مرکزیت کو توڑ کر ، ان میں ضعف پیدا کردیا تھا ، مغرور اور سرکش امرا قوت پکڑ چکے تھے ، اور سلطنتوں کی پالیسی ، اور حربی کار روائیوں کا انحصار

صرف انھیں امرا کے رحم و کرم پر رہ گیا تھا، جو لڑائی کو قوموں کی زیست و موت کا سوال نہیں، بلکہ صرف جیوٹ دکھانے کا ایک مشغلہ سمجھتے تھے۔ ان کے مقابلے میں ترکی عساکر کی جان، "جانثاری" تھے، جو فطرتاً جیالے، فوجی ضبط کے سانچہ میں ڈھلے ہوے، سخت مزاج اور بہادر افسروں کے سدھائے ہوے کار آزمودہ سپاہی تھے، اور کٹھ پتلیوں کی طرح ترکی سلطان کے اشاروں پر چلتے تھے۔ تورانی تہذیب جتنی پچکلیاں تھی اتنی ہی ان کی فوجی قابلیت اور فنون جنگ بر محل اور مناسب موقع ہوا کرتے تھے۔ اگرچہ وسط ایشیا کے گیارہ زاروں کے حربی اصول اصل میں قدیم ایرانی حربیات سے ماخوذ تھے، لیکن ترک، چونکہ پیدائشی سپاہی تھے، اس لئے ان کی تیز نگاہیں بدلے ہوے حالات کو فوراً تاڑ لیتی تھیں، اور نئی نئی ایجادوں، یا نئے نئے حالات کے اقتضاء سے وہ فوراً اپنے فنون جنگ میں بھی رد و بدل کردیا کرتے تھے۔ ترکی فوج کے پاس سارے یورپ کے مقابلے میں جدید ترین اسلحہ موجود تھے، حالانکہ جس واحد یورپی سلطنت پر انھوں نے حملہ کیا، اس کا ساز و سامان صرف تھوڑا بہت جدید تھا۔ انھوں نے توپ خانے کی اہمیت اور ضرورت کو بھی بہت جلد سمجھ لیا تھا، اور مختلف دھانے کی توپیں ڈھالنے میں ایسا کمال دکھلایا تھا کہ کوئی قلعہ ان کی تباہ کن گولے باری کی تاب نہ لاسکتا تھا۔ قسطنطنیہ کے محاصرے میں انھوں نے ۴۵ سنٹی میٹر دھانے کی برنجی توپیں استعمال کی تھیں۔ مشرقی یورپ کے تمام قلعے صرف سواروں کے حملے اور ہلکی توپوں کی گولہ باری کی رعایت سے بنائے گئے تھے، اور اسی غرض سے ان کی دیواریں سیدھی اور اونچی رکھی گئی تھیں، لیکن ترکوں کی بھاری توپوں کو دیکھکر، سولھویں صدی کے آخر زمانے میں نئے اصولوں پر قلعوں کی تعمیر

ہونے لگی، یعنی ان کی فصیلیں ڈھلواں اور نیچی بنائی جانے لگیں۔ ان فنی حیثیتوں سے بڑھے ہوئے ہونے کے علاوہ، ترک جوش شجاعت میں بھی یورپ والوں سے بمراتب زیادہ تھے، ہر فتح کے بعد ان کی ہمتیں بلند تر ہو جاتی تھیں، مال غنیمت ان کے ہاتھ آتا تھا، اور جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ ان میں جوش زن ہو جاتا تھا۔ ترکوں کی پے در پے فتوحات میں، اسلام اور اس کی مجاہدانہ تاثیر کا بہت کچھ دخل تھا۔ پہلے وہ بت پرستوں کی حیثیت سے محض غارت گری اور نام آوری کے خیال سے لڑا کرتے تھے، لیکن اسلامی تبلیغ و اشاعت کے بعد جوہر ایمان کی آمیزش سے ان کی شجاعت کا ایک اخلاقی نصب‌العین پیدا ہو گیا تھا، اور اس سے ان کی جنگ جوی کے جوہر اور کھلتے تھے۔ ان کے شروع زمانے کے سلاطین کی تربیت بھی معسکر کی سادہ اور صحت بخش فضا میں ہوئی تھی، ان کے خمیر میں بھی، اپنے سپاہیوں کی طرح، شجاعت اور بسالت کے جوہر موجود تھے، اور ان کی حربی قابلیت بھی اپنے تمام ہم عصر بادشاہوں سے کہیں زیادہ تھی —

جب ترکوں نے اپنی فتوحات کا سلسلہ شروع کیا، تو انھیں صرف زوال پذیر بازنطینی سلطنت اور ریاست ہائے بلقان ہی سے مقابلہ کرنا پڑا تھا، لیکن جب وسعت حدود کے اعتبار سے عثمانی قوت اپنے پورے عروج پر پہونچی، تو اب اسے متعدد قوی تر دشمنوں کا سامنا کرنا پڑا۔ حربی نقطہ نظر سے اب اس کا محل وقوع بھی کمزور ہو گیا تھا، اس لئے کے جیسے جیسے حدود سلطنت "اناطولیہ" سے دور ہوتی گئیں سلسلۂ رسل و رسائل طویل ہوتا گیا۔ اُدھر، سترویں صدی میں یورپ بھی ایک نیا جنم لے چکا تھا۔ نئی نئی ایجادیں اور اکتشافات ہو چکے تھے، تحقیق علمی کے

اصول بن چکے تھے ، جنگ ہائے اصلاح (Wars of Reformation) ختم ہوچکیں تھیں ، قومی احساسات رکھنے والی مستقل قومی سلطنتیں مستحکم ہوچکی تھیں ، اور ازمنہ وسطیٰ کے دور جاگیریت کے کم مایہ اور نیم علم افراد کی بجائے ، اب یورپ والوں کی ایک قابل نسل پیدا ہوچکی تھی ۔ سلطنتوں کے آپس کے سمجھوتوں اور صلح ناموں نے لشکر آرائی کا راستہ کھول دیا تھا ، اور اب باقاعدہ یورپی فوجیں ، جو فنی حیثیت سے اعلیٰ درجہ کی اور روحانی اعتبار سے ترقی یافتہ ہوچکی تھیں ، ترکوں کے حق میں خطر ناک اور نا قابل تسخیر دشمن بن گئی تھیں ۔ سترھویں صدی میں امریکہ کی دریافت ، اور اس کی پیداوار کی خرید و فروخت نے بحیرہ قلزم کی بجائے بحر اوقیانوس کو دنیا کی تجارت کا راستہ بنا دیا تھا ۔ افریقہ کا چکر کاٹ کر جانے ، اور دنیا کی تجارتی گزرگاہوں میں تبدیلی ہو جانے کی وجہ سے ترکی کی ترقی میں بہت کچھہ خلل واقع ہوا ، اس لئے کہ اب وہ ، ایک اعتبار سے ، ترقی یافتہ قوموں کے ربط و اختلاط سے محروم ہو گیا ۔ مذکورۂ بالا اسباب نے ترکی کی طرح ، اٹلی کو بھی اقتصادی حیثیت سے نقصان پہونچایا ، لیکن اس نے پھر بھی اپنی تہذیب اور تمدن کے سرمایہ کو محفوظ رکھا ، بلکہ اس کی توقیر بھی کی ، لیکن ترکی میں ، جیسے ہی فتوحات کا سلسلہ بند ہوا ، ویسے ہی وہ اپنی مفتوحہ طباع قوموں کے تہذیبی سرمایہ سے بھی محروم ہو گیا ، اور اس کا تمدنی ارتقاء رک گیا -- وہ دنیا سے الگ تھلگ اور نئے ترقی یافتہ خیالات سے محروم ہو گیا ، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ کو تو ان جدید خیالات نے ہمیشہ نئی زندگی بخشی ، اور اسے مشرقی تہذیبوں

کے تقابلی مطالعہ پر آمادہ رکھا ' لیکن ترکی انہیں فرسودہ نظامات کا پا بند ' اور انہیں بوسیدہ ادارات کو سنبھالے رہا - یورپ نے تو اصلاح کے بعد سے توھمانہ اور ملایانہ خیالات کو بالائے طاق رکھہ دیا ' لیکن ترکی ایک ایسے مخصوص مراعات رکھنے والے طبقہ کا شکار بن گیا ' جس نے اسلام سے ارتقاء کی روح کو سلب کرنے کی کوشش کی —

جن داخلی اسباب نے ترکی کو کمزور بنایا ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ جیسے جیسے اس کی حدود میں توسیع ہوتی گئی ' ویسے ویسے رسل و رسائل کے طویل سلسلوں کی کماحقہ نگرانی ناممکن ہوتی گئی ' اور سرحدی مقامات کے ساتھہ سلسلہ اخبار و اطلاعات برقرار رکھنے کے لئے بعض درمیانی علاقوں کو ایک طرح کی نیم خود مختاری دیدی گئی ' مثلاً "کریمیا" "والیشیا" اور "ھنگری" ان کے علاوہ ' "عرب" شمالی " افریقہ " " مصر " " طرابلس " اور الجزائر ' نیم خود مختار صوبجات تھے - ان صوبجات کا علاقہ وطنی حکومت ' یعنی ایشیائے کوچک کے ساتھہ کچھہ زیادہ استوار نہ تھا - جیسے جیسے سلطنت بڑھتی گئی ' اس کے باشندوں کی قومیتوں اور مذھبوں کی بو قلمونی بھی زیادہ ھوتی گئی ' جن میں اور حکمران قوم میں کوئی وجہ اشتراک نہ تھی ' اور اندرونی ناچاقیوں اور شورشوں نے ھیئت سیاسیہ کو کمزور کرنا شروع کردیا — '

سلطنت ترکیہ کے اختلال کا خاص الخاص سبب اس حس حکمرانی یا ملکہ بادشاھی کا زوال تھا ' جو پہلے حکمران کی شخصیت میں مجسم بن کر ظاھر ھوا کرتا تھا - ھم یہ پہلے بتا چکے ھیں کہ تورانی سلطنت کا مدار تمام و کمال شخصیت پر ھوتا تھا ' اور اس قسم کا نظام حکومت ' بہت آسانی

کے ساتھ مذھب اسلام سے میل کھا سکتا تھا ' اس لئے کہ اگرچہ اسلام کی اصلی روح جمہوریت ھی ھے ' لیکن ساتھ ھی ساتھ مطلق العنان بادشاھوں کا ریاست کے جملہ عاملانہ اختیارات کو اپنی ذات واحد میں جمع کر لینا بھی اسلامی اصول کے منافی نہیں ھے - خلیفہ بحیثیت اعلیٰ تر ین محافظ شریعت کے - اور سلطان بحیثیت ترکوں کے ارضی حکمران کے ' ان دونوں فرائض کے ایک ذات میں جمع ھو جانے کی وجہ سے ترکی سلطان کی شخصیت بمراتب زیادہ ھو گئی تھی ' وہ سلطنت کا مالک تھا اور ساری رعایا اس کی حلقہ بگوش تھی - ھیئت سیاسیہ کی تنظیم سے تو ھم بعد میں بحث کریں گے - سردست اسی قدر کہہ دینا کافی ھے کہ حکمران کی قوت میں ضعف کے نمودار ھوتے ھی یہ سارا ڈھچر ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگا - سلطان سلیم " مست " کے زمانہ تک جتنے بڑے بڑے سلاطین گزرے ' وہ سب کے سب جوان اور جنگ جو بادشاہ تھے ' جو نظم و نسق مملکت کی باگ اپنے ھاتھ میں مضبوطی سے لئے رھتے تھے اور بہ نفس نفیس جنگی کار روائیاں کیا کرتے تھے -- لیکن " سلیم " کے بعد جو آٹھ سلاطین یکے بعد دیگرے تخت پر بیٹھے ' ان میں سے پانچ تو کسی فوجی مہم میں شریک تک نہ ھوے ' بلکہ رعایا سے روپوش ھو کر حرم سرا کے اندر رھنے لگے -- ان کے ولی عہدوں اور شہزادوں کو شروع میں تو سازش کے ڈر سے قتل کر دیا جاتا تھا ' لیکن بعد کو انھیں عمر قید دی جانے لگی - ان میں سے بعض ' آئندہ چل کر تخت نشین ھوے ' لیکن چونکہ ان کی ساری زندگی خواجہ سراؤں اور دوسرے غیر ذمہ دار جلیسوں کی صحبت میں گزری تھی ' اس لئے ان میں سلطنت کا بار گراں اٹھانے کی اھلیت مطلق باقی نہ رھی تھی - سلاطین ' خائن عہدہ داروں کے ھاتھ میں نری کٹھ پتلیاں تھے -

رشوت، سازش، غیبت ، ان سب کا اثر محل سرا تک پہونچنے لگا تھا، اور صوبجات کے والیوں نے مرکز کی کمزوری سے فائدہ اٹھاکر، ہر ناجائز طریقہ سے دونوں ھاتوں سے دولت سمیٹنی شروع کردی تھی - غرض باز نطینی سلطنت کی ساری شامتیں اور عیاشیاں اس لاجواب ھیئت سیاسیہ پر مسلط ہوگئیں جسے ابتدائی سلاطین نے اپنی قابلیت سے قائم کیا تھا ، اور ترکی قوم نے جس سلطنت کو اپنے خون سے سینچا تھا، اس کی بنیادیں کھوکھلی ھوگئیں - نتیجہ یہ ھوا کہ سلطنت کی توسیع یک لخت بند ھوگئی ، علاقوں پر علاقے ھاتھہ سے نکلنے لگے، جس سے خزانہ شاھی میں تشویش انگیز کمی واقع ھونے لگی، لیکن نا عاقبت اندیش اور رنگین مزاج عمال سرکاری کے حلقوں میں بدستور رنگ رلیاں منائی جاتی تھیں- بغاوتوں، شکستوں، اور تاوانوں کی گرانباری نے غریب رعایا کو، جس کی مصیبتیں دن بدن بڑھتی جاتی تھیں، پیس ڈالا - جان نثاری افواج بھی، جو ھمیشہ سے فوج کی جان اور ترکوں کی فتح کی ضامن تھیں، بکتا شیوں اور دوسرے شورہ پشت عناصر کے ساتھہ جاملیں، اور ملک کے امن و امان کے حق میں دشمن ثابت ھونے لگیں، یہاں تک سلطان محمود ثانی نے جو ایک مصلح اعظم تھا، انہیں نیست و نا بود کر ڈالا - سلطنت کا نظم و نسق، خواہ بہتر سے بہتر طریقہ ھی پر کیوں نہ کیا جاتا، لیکن فرسودہ اور از کار رفتہ ھوچکا تھا ، اور تنگ نظر اور قدامت پرست رعایا اور خائن عمال کی مخالفت کی وجہ سے اسے توڑنا اور اس کی جگہ بہتر اور مفید تر نظام قائم کرنا ممکن نہ تھا —

معاشرت کے اعلی طبقوں سے ھوتا ھوا یہ اندرونی مرض آھستہ آھستہ ادنی طبقوں میں سرایت کرتا گیا - اور صدیوں تک ترکی سوسائٹی نے اخلاقی کش مکش کی وہ سختیاں اٹھائیں کہ کوئی اور قوم اس طرح ٹھنڈے دل سے اسے گوارا نہ کرتی، نظم و نسق نے بد سے بدتر صورت اختیار کی، ترکی جنرلوں کے دامن تک رشوت ستانی کے دھبہ سے آلودہ ھوگئے، لیکن آفریں ھے ترکی قوم کو کہ ان کی معصوم سادگی اور اور دیانت میں آج تک فرق نہیں آیا ! —

عثمانی تہذیب کی خصوصیت خاصہ اور اس کے اجزا کیا تھے؟ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جیسے جیسے وہ وسط ایشیا سے مغرب کی طرف بڑھتے گئے، جن جن باشندوں سے ان کا سابقہ پڑا، ان کی تہذیب انھوں نے اختیار کی - اسلام کی عجمی شکل، نیز شیعیت اور ''صوفیت'' نے، جن کے گروہ اسی زمانے میں منظم ہوچکے تھے، ترکوں کے تخیلات کو اپنی طرف کھینچا - ایشیائے کوچک صدیوں سے مختلف تہذیبوں اور تمدنوں کا سنگم رہ چکا تھا - تو ہم پرستی کے زمانہ کے باقیات، بازنطینی، یونانی اور سلجوقی ایرانی تہذیبوں کے اجزا خلط ملط ہوکر ایک ایسا طرفہ معجون بن گئے تھے، جس کے اجزائے ترکیبی کی تحلیل تو ممکن ہے، لیکن جو خود محض ان مفرد اجزا کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک دوسری ہی چیز ہوکر رہ گیا ہے - ایشیائے کوچک سلجوقیوں ہی کے زمانہ میں ترکی رنگ میں رنگا جاچکا تھا، اور کے خاں ای، نو واردوں کو جن کی کل تعداد بمشکل دو ہزار سواروں سے زیادہ ہوگی، اپنی فوجی مہموں اور نئے مفتوحہ علاقوں کو بسانے کے لئے ہمیشہ کافی تعداد میں ترک مل سکتے تھے - تعداد ازدواج کے دستور نے بھی ترکوں کو بڑا فائدہ پہونچایا، اس لئے کہ مسلسل جنگوں میں انسانی جانوں کی جو زبردست قربانیاں انھیں دینی پڑیں، اس کی تلافی اضافہ آبادی سے ہوجاتی تھی - لیکن اس کے باوجود ترکی قوم آج تک یہ نہ کرسکی کہ اپنے علاقوں کواپنےہم قوموں سے آباد کردے، یا وہاں کی رعایا کو اپنی قومیت کے اندر جذب کرلے ـــ

ترکی ہیئت سیاسیہ کا شروع ہی سے یہ خاصہ رہا ہے کہ حکمران طبقہ جمہور سے بالکل الگ تھلگ رہتا ہے- قومیت کے جدید تصور کی رسائی ترکی جمہور کے ذہنوں تک آج تک نہیں ہوئی ہے، اور عربی اسلام کے بر خلاف جس نے مذہبی تبلیغ کے ذریعہ غیر اقوام کو معرب بنا دیا، ترک نہ تو بلقان کو "ترکا" سکے اور نہ اناطولیہ کو بلکہ محض آباد کاروں کی حیثیت سے رہے اور کسی قسم کی قومی یک جہتی نہ پیدا کرسکے- ترکی

تشکیل سیاسی میں ہمیں ایک عجیب دو رنگی نظر آتی ہے، جو صرف اس حد تک کہ سلطان کی اطاعت شعاری کا تعلق ہے نسلی رشتوں کو منقطع کرکے سب کو ایک اسلامی شیرازہ میں منسلک کردیتی ہے - غیر ملکی اور غیر وطنی لوگ بھی اسلام قبول کرکے، سلطان کی ملازمت میں داخل ہوسکتے تھے - یہ گویا نسلی انضمام کی ایک ترغیب تھی، اور عثمانیوں کی تاریخ میں ہمیں اس کی مثالیں بکثرت نظر آتی ہیں کہ لوگ برضا و رغبت اسلام لاکر، حکمران طبقہ کی تعداد میں اضافہ کا باعث ہوے ہیں - عیسائیوں پر مسلمانوں کے مقابلہ میں محاصل کا بار زیادہ تھا، اور شاید اس کی وجہ سے بھی اسامی اور کاشتکار اسلام کے حلقہ میں داخل ہوے - وسط اناطولیہ میں قرامانی، اور مغربی اناطولیہ کے باشندے نسلی حیثیت سے ترک نہیں ہیں بلکہ مذہب اور بعد کو زبان کے اثر سے ترکی بن گئے ہیں - جب ترکوں نے اپنی سلطنت کا پایہ رکھا، تو اس وقت بھی ان کا نظم و نسق وہی قدیمی پچھکلیان قسم کا تھا، اور انتظام ملکی تقریباً تمامتر نو مسلموں کے ہاتھوں میں تھا - اس سے ایک نیا اور مصنوعی طبقہ پیدا ہو گیا ' یعنی حکمران طبقہ، جو با وصف نسلی اختلاف کے، ملازمت سلطانی میں آکر مسلمان ہوگیا تھا - مرور ایام سے اور جیسے جیسے فتوحات کا سلسلہ بڑھتا گیا، یہ طبقہ دن بدن کثیرالتعداد اور جمہور سے الگ تھلگ ہوتا گیا - یہ ایک عجیب و غریب تاریخی معما ہے کہ ترکی جمہور نے، جو قدیم‌الایام سے فتح و تسخیر کی قوت اور نظم و نسق کی صلاحیت میں بڑھی چڑھی تھی، غیر ترکی اجزا کی ایک ایسی فاتح فوج اور ایسی انتظامی جماعت پیدا کردی، جو اپنے کو خود ترکوں سے الگ اور بڑھا ہوا سمجھتی تھی۔ یہ لوگ خود کو 'عثمان لی' کہتے تھے، جس کے معنی ہیں خاندان عثمان کے حلیف، اور جمہور کو جنھیں وہ ' ترک ' کہتے تھے ' نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے - 'عثمان لی' کے اس حکمران طبقہ کا صدر اعلیٰ سلطان ہوتا تھا ' جو اپنی رعایا کے جان و

سال کا حاکم علی الاطلاق تھا - اس استبدادیت کا اصول یہہ تھا کہ عوام الناس
کے نفع کو مد نظر رکھتے ہوے ' ان کے ساتھہ پدری شفقت برتی جاے '
اور جمہور کی قوتوں پر اقتدار کلی حاصل رہے - اس ہیئت سیاسیہ کی
مثال بالکل لشکر گاہ کی سی تھی ' جہاں سالار عسکر اپنی افواج کی
ضروریات زندگی مہیا کرتا اور جس طرح چاہتا ان سے کام لیتا ہے - رعایا
سلطان کی غلام تھی - شروع میں " عثمان " اور " اور خان " جیسے سردار
اپنے لئے قدیم ترکی لقب " بے " استعمال کرتے تھے ' سب سے پہلے
" سلطان " اور " خان " کے القاب " یلدرم " نے اختیار کئے - رعایا
کے حال پر ترکی سلاطین کی پدری شفقت کی مثالیں ہمیں شروع کے
سلاطین میں نظر آتی ہیں ' جن کی زندگیاں بہت سادہ ہوتی تھیں '
اور جو جمہور کے قدیم مراسم و رواج پر کار بند تھے - جیسے جیسے
ممالک محروسہ میں توسیع ہوئی ' اور محل کے عہدہ داروں کی تعداد
بڑھی ' ویسے ویسے نمائش اور تصنعات بھی بڑھنے لگے ' اور سلطان اپنے
مشیروں سے دور دور رہنے لگا - " سلطان محمد ثانی " اپنے وزیروں کی
مجلس میں بیٹھا کرتا تھا - ایک مرتبہ ایک دھقان کچھہ فریاد لیکر
ایوان میں آیا ' اور پوچھنے لگا کہ " تم میں سے سلطان کون ہے ؟ "
اس واقعہ کے بعد سے سلطان دریچہ کے پیچھے بیٹھکر اپنے وزراء کی
بحثوں کو سننے لگا - " سلیمان " کے زمانے سے یہہ دستور ہوگیا کہ اب سلطان
مجلس وزراء میں شرکت کی زحمت گوارا نہ کرتا تھا ' بلکہ وزیر اعظم
تخلیہ میں مجلس وزراء کے تصفئے گوش گزار کیا کرتا تھا اور سلطان کا
حکم آخری اور قطعی ہوتا تھا - تعجب کی بات ہے کہ جیسے جیسے سلطنت میں
زوال آنے لگا اور صوبجات یکے بعد دیگرے ہاتھہ سے نکلنے لگے ' ویسے ویسے

سلطانوں کا غرور اور تمکنت بڑھتے گئے اور ان تک باریابی دشوار ہوتی گئی ' اور ساتھہ ھی محل سرا کے نا عاقبت اندیشانہ اور بد تر اثرات ان کی مرضی پر حاوی ھوتے گئے - شروع کے جنگ جو سلاطین اپنے بیٹوں کے اندر اپنی جنگی روح پھونکا کرتے اور ان میں سے اپنا جانشین نامزد کرتے تھے - " سلطان احمد اول " کے عہد سے قانون وراثت بدل دیا گیا اور اب تخت کی جانشینی خاندان کے بزرگ ترین رکن کے حصہ میں آنے لگی —

باب حکومت ' جو سلطان کی مجلس شوریٰ تھی ' ان ارکان پر مشتمل تھی - صدر اعظم ' دو قاضی عسکر ' قاضی قسطنطنیہ ' جانثاریوں کا افسر اعلیٰ ' نشانچی (مہر بردار شاھی) ' خزانچی اور سالار عساکر - باب حکومت کے اجلاس روزانہ صبح میں ھوتے تھے ' اور اس کی کارروائیاں اس طرح شروع ھوتی تھیں کہ رئیس الکتاب تجویزیں اور کاغذات پڑھکر سناتا تھا - ' خوجگیان ' احکامات قلم بند کر کے مختلف عہدہ داروں کے پاس روانہ کرتا تھا - اھم قانونی معاملات میں ' باب حکومت ھی اعلیٰ ترین مجلس مرافعہ ھوتی تھی - اجلاس کے بعد سلطان تخلیہ میں صدر اعظم اور دوسرے وزراء کو طلب کرتا ' اور ان کی تجاویز سنتا تھا - نئے تقررات اور مختلف عہدوں کی خلعت بخشی بھی اسی موقع پر ھوتی تھی - سترھویں صدی عیسوی میں یہہ دستور العمل متروک ھوگیا ' اور اب باب حکومت کے جلسے گاہ گاہ صدر اعظم یا شیخ الاسلام کے محل میں منعقد ھونے لگے - جب " محمود ثانی " نے نظم و نسق کی اصلاح کی طرف توجہ کی اور وزیروں کا تقرر کیا تو اس نے یہہ قاعدہ بنایا کہ صدر اعظم کی صدارت میں ھفتہ میں دو مرتبہ اجلاس ھوا کرے - وزیروں کو ' ان کے منصب کے

اعتبار سے سہ اسپ (*) دمہ نشان عطا ہوتا تھا اور صدر اعظم کو چہار اسپ دمہ - سلطان کے خیمہ کے سامنے سات دموں کے نشانات نصب کئے جاتے تھے - وزیر کے خیل و خدم میں بعض اوقات کئی کئی ہزار آدمی ہوتے تھے —

اصطلاحی حیثیت سے ' عثمانی نظم و نسق کے اہم شعبے ' یعنی دیوانی ' فوجی اور عدالتی آپس میں بہت کچھہ غلط ملط تھے 'لیکن ایک حد تک درجہ بندی کی کوشش بھی کی گئی تھی - ساری سلطنت کو ولایتوں ' سنجقوں اور قضاۃ میں منقسم کیا گیا تھا - ولایتوں اور سنجقوں کے والی فوجی افسر بھی ہوا کرتے تھے ' فوجیں ان کے جلو میں رہا کرتی تھیں اور لڑائی کے زمانے میں جاگیردار اور امرا جو فوجی دستے بھیجتے تھے ' ان کی سرداری بھی یہی والی کیا کرتے تھے - سنجق کے افسر اعلیٰ کو ایک اور ولایت کے والی کو دو نشان عطا ہوتے تھے - " اناطولیہ " اور " روميليا " (یعنی یورپین ترکی) کے " بے " ان کے اوپر دو بگلر بے مقرر ہوتے تھے ' جو فوجی دستوں کی کمان بھی کیا کرتے تھے - اگر میمنہ اور میسرہ کی کمان پر کوئی شہزادہ نہ ہوتا ' یہی دونوں ' بے ' میدان جنگ میں ان کی کمان پر مقرر کئے جاتے - ان اہم خدمات پر تقررات ایک خاص طریقہ پر ہوتے تھے ' جیسے " دوشرمہ " کہتے تھے ' یعنی بلقان اور دوسرے مقامات سے عیسائی بچوں کو اٹھالے جانا ' اور انھیں مسلمان بناکر ان مخصوص خدمات کے لئے تیار کرنا - یہہ لوگ سلطان کے خاص محافظ ہوتے تھے —

دوسری اہم خدمات یہہ تھیں : دفتر دیوانی ' جو مجلس وزراء کے

(*) یہہ ترکی نشان تھا ' گھوڑے کی دم نیزے کے سرے پر باندھی جاتی تھی ' دموں کی تعداد کی مناسبت سے ' پاشاے دو نشان پاشاے سہ نشان وغیرہ کہلاتے تھے - ۱۲ - مترجم ---

فیصلوں کو ضبط تحریر میں لاتا اور دوسرے دفتروں کو بھیجتا تھا ' دفتر حقانی ' جس میں اراضیات کے متعلق کاغذات رہا کرتے تھے ' اور خزانہ۔ دیوانی دفتر کا صدر اعلیٰ رئیس الکتاب ہوتا تھا ' جو سفارت خانوں کے ساتھہ مراسلت کرتا ' اور غیر قوموں کے ساتھہ امور سلطنت کی گفت و شنید کرتا تھا —

ایک اور اہم عہدہ ' نشانجی یا رجسٹرار کا ہوتا ' جو زمینات کی تقسیم کرتا ' سلطانی فرامین پر مہر لگاتا اور نئے مفتوحہ علاقوں کے متعلق اندراجات کرتا تھا۔ ' دفتر دار ' کا عہدہ وہی تھا جو آج کل صدر المہام فنانس کا ہوتا ہے۔ ابتداء میں صرف ایک ' دفتر دار ' ہوتا تھا ' لیکن بعد کو یورپی اور ایشیائی مقبوضات کے لئے علیحدہ علیحدہ دفتر دار ہوتے تھے۔ وہ محاصل کی جمع بندی اور اخراجات کی نگرانی کیا کرتے تھے۔

علماء کا طبقہ ' جو اسلامی ممالک کے سیاہ و سفید میں بہت کچھہ دخیل تھا ' ترکی میں محمد ثانی کے زمانہ میں وجود میں آیا۔ شروع میں ان کے فرائض قاضی عسکر کی حیثیت سے صرف فوج تک محدود تھے اور پندرویں صدی کے ختم تک مفتی اعظم کی کوئی علیحدہ خدمت نہ ہوتی تھی ' بلکہ قاضی بروسا ' یا قسطنطنیہ کا قاضی یا کوئی اور عالم جو پادشاہ کے اشاروں پر چلتا ' اس خدمت پر مقرر کیا جاتا۔ اس طریقہ تقرر سے ' اس اعلیٰ عدالتی عہدہ کی اہمیت بہت کچھہ کم ہو گئی تھی ' اور اگرچہ بعض قوی الارادہ شیخ الاسلام کبھی کبھی اپنے خاص اختیار کو کام میں لاکر سلاطین کی فضول خرچیوں کو روک دیا کرتے تھے ' لیکن عموماً ان میں سے اکثر سلاطین کے ہاتھوں میں محض بے جان آلہ کی حیثیت رکھتے تھے اور خلاف احکام شریعت ' فتاوے صادر کیا کرتے تھے —

تر کی حکمران طبقه میں علماء کا طبقه هی خالص اسلامی عنصر تها ،
یعنی اس میں وہ عیسائی بچے شامل نه کئے جاتے ' جو ترکی مقبوضات
سے پکڑ کر لائے جاتے تھے ' بلکه اس طبقه کے افراد ترکوں اور عربوں کی
اولاد هوا کرتے تھے ' اور ان کی جماعت ' بعد میں غیر ملکی نسل کے عہدہ داروں
کے خلاف بوی هوگئی تھی ۔ اس ڈر سے که سلطان ' یا فوج ان کے اقتدارات
میں مداخلت نه کر سکے ' انھوں نے اپنے پیشه کی حیثیت خاندانی اور موروثی
بنادی تھی ' اور گود کے بچه بھی " علماء " (بشک علمالی غی) کہلاتے تھے ۔
اس مذموم طریقه نے جس کی ابتداء محض حفاظت خود اختیاری کے طور
پر اور عمال سلطنت کی مداخلت بیجا کو روکنے کے لئے کی گئی تھی
آگے چل کر علماء کی علمیت اور اعزاز کو بہت کچھه نقصان پہنچایا ۔
عثمانی سلطنت کی مخصوص هیئت ترکیبی کے اعتبار سے اس کا اهم
ترین طبقه ' اور اس کی ساری قوت فوج تھی ۔ اس زمانه میں بھی جب که اس
سلطنت کی حیثیت محض ایک دیہاتی جماعت کی سی تھی ' اس کا دار و مدار
اپنے جاگیری نظام اور فوجی تنظیم پر تھا ' مغربی ملکوں کی طرح سے '
ترکی کے جاگیرداروں کے فرائض میں بھی فوجی خدمت داخل تھی ۔
پندرویں صدی کے اوائل میں ' اورخان ' اور مراد نے جاگیرداروں کی متلون المزاجی
سے محفوظ رہنے اور شورشوں کو فرو کرنے کے لئے ایک ایسی تدبیر اختیار
کی جس نے تھوڑی هی مدت میں ترکوں کو دنیا کی بہتر سے بہتر جنگی دول
کے دوش بدوش کھڑا کردیا ' انھوں نے ایک نئی فوج " ینی چری " بھرتی
کی ۔ عام روایت کے بموجب یه سپاہ قلندروں کی جماعت بکتاشی سے بھرتی
کی گئی ' لیکن زمانه حال کی تحقیق نے یه ثابت کیا هے که بکتاشیوں کی
جماعتیں جانثاریوں کی بارکوں میں سولھویں صدی میں داخل هوئیں ' اور

وہ بھی اس خیال سے کہ ان پر الحاد کا جو شبہ کیا جاتا تھا، وہ مٹ جائے - جا نثاری فوج، طبعاً اور اخلاقاً، ایک زبردست اور نا قابل تسخیر اور ہر حیثیت سے قابل اعتماد فوج تھی، اس میں زیادہ تر ایسے بد نصیب افراد شریک تھے، جنھیں بچپن ھی میں گھروں سے پکڑ کر ایسی جکڑ بند اور ایسے ماحول میں رکھا گیا تھا کہ ان کے دل والدین کی محبت یا حب وطن کے جذبات سے قطعاً نا آشنا تھے - انھیں صرف ایک ھی اخلاق کی تعلیم دی گئی تھی، یعنی آقا کی اطاعت، اور ان کے دل میں صرف ایک ھی امنگ اور آرزو تھی، یعنی ترقی پانا، اور روپیہ کمانا - ظاھر ھے کہ فتوحات ملکی کے لئے اس بے جگر گروہ سے زیادہ اور کون موزوں ھو سکتا تھا - یہ نئی فوج سات طبقوں پر مشتمل تھی جو سب کے سب محل شاھی کے غلام (قاپو قلعہ) تھے، بارکوں میں رھتے اور شاھی خزانہ سے مقررہ مشاھرہ اور روزانہ بھتا پاتے تھے - اس باقاعدہ فوج کا بہت بڑا حصہ پیدل سپاہ پر مشتمل تھا - اس کے ۱۹۶ دستے تھے اور ھر دستہ میں مختلف اوقات میں ۶۰ سے لیکر ۲۰۰۰ آدمی تک ھوتے تھے - 'محمد ثانی' کے زمانہ میں جانثاریوں کی جنگی جمعیت بارہ ھزار کی تھی، 'محمد ثالث' کے زمانہ میں چالیس ھزار اور 'سلیم ثالث' کے عہد میں ان کی تعداد ھر زمانہ سے زیادہ یعنی ایک لاکھ دس ھزار تھی - ھر دستہ کی وردی، اس کی مخصوص خدمت کے اعتبار سے الگ رنگ کی ھوتی تھی، اور ھر دستہ کا اپنا الگ معرکہ تھا، کسی کا معرکہ کنجی تھا، تو کسی کا مچھلی اور کسی کا جہاز کا لنگر - یہ معرکے ان کے اپنے اپنے جھنڈوں پر بنے رھتے اور اکثر سپاھیوں کے بازووں اور پنڈلیوں پر گودنے سے گدے ھوتے - ھر دستہ کے مغنی اس کے ساتھ رھتے، اور جا نثاری افواج کے روایتی فوجی مراسم ھمیشہ پابندی

کے ساتھہ پورے کئے جاتے - 'اور خان' کے عہد میں ہر جا نثاری کی روز کی تنخواہ ایک اقچہ تھی' جس میں ایک ثلث درہم کے برابر چاندی ہوتی تھی - بعد کو روزانہ تنخواہ پانچ یا چھہ اقچہ ہو گئی تھی - اور خاص خاص افراد کو اگر کوئی کار نمایاں کریں تو آٹھہ اقچہ تک دئے جاتے تھے - بعد کو جب مالیات ملکی کی بد نظمی کی وجہ سے' چاندی نے سکوں میں میل ہونے لگا اور ان کی قیمت میں فرق آگیا' تو تنخواہ بھی بڑھا کر بیس اقچہ کردی گئی - اس تنخواہ کے علاوہ' ہر دستے کو باقاعدہ روٹی' روغن' دال' موم بتی اور وردی کی رسد ملا کرتی تھی - رسد کی تقسیم سہ ماہی ہوتی تھی اور ہر سہ ماہی کا نام اس کے مہینوں کے پہلے حروف ملا کر رکھا گیا تھا' مثلاً "مصر" (محرم' صفر' رابیع‌الاول)' " رجج ربیع‌الآخر' جمادی‌الاول' جمادی‌الثانی) وغیرہ —

رسد کی تقسیم ایوان باب حکومت کے سامنے ہوتی تھی' اور اس کے لئے منگل کا دن مقرر تھا - تمام دستے فوجی ترتیب کے ساتھہ آگے بڑھتے' صدر اعظم اور اس کے مقربین کو آداب بجا لاتے' اور پھر اپنے سردار کا اشارہ پاکر کھانے بیٹھہ جاتے - کھانے میں شوربہ' چاول' اور گوشت ہوتا' جو محل سرا کے مطبخ میں پکایا جاتا - کھانے پر بیٹھنا گویا اس کی علامت تھا کہ وہ اپنے آقا کے نمک حلال ہیں - کھانے سے فراغت پاکر پھر سب ایوان کے سامنے جمع ہوتے' یہاں ان کے کپتان دونوں ہاتھہ سینے پر باندہ کر " گلبانگ " (جانثاریوں کا نعرۂ جنگ) پڑھتے :—

" لااله الاالله باش عریان' سینه پریان "

" قیلیج آل قان — بو میدانده نیجه باشلر "

" کسیلیر هیچ اولمان صوران - ایوالله "

" ایوالله قهر مُز قیلیجمز دشمانه زیاں ۔ "
" قوللغمز باد شاهه عیاں ۔ اوچلر یدیلر "
" قیر قلر گلبانگ محمدی ' نور نبی کرم علی "
" پیرمز خدا وندکار مَز حاجی بکتا شی ولی "
" دمنه ' دو راننه هُو ' ه ییه لم هو ! "
(ترجمه: لااله الاالله ' برهنه سر اور سینه صاف
هوکر اے میری تلوار خون پی ؛ یہاں هزاروں
سر دهڑ سے جدا هوتے هیں'اور کوئی نہیں پوچھتا
که کیوں ؛ والله ' بالله هماری فوج اور هماری
تلوار دشمنوں کے حق میں زیاں هے ۔ هم
بادشاہ کے نمک خوار هیں ' تین سات اور
اکتالیس نعرہ لگاؤ نور نبی ' کرم علی
اپنے پیر و مرشد حاجی بکتاش ولی کے لئے ۔ نعرہ
لگاؤ اس کے نام کے")

اس کے بعد ایک مقررہ اشارہ پاکر اپلی اپنی مقررہ جگه کی طرف جھپٹ کر سکوں کی تھیلیاں اٹھا لیتے اور بارکوں میں جاکر انھیں تقسیم کرتے۔ پیسٹھویں دستے کو اس رسم میں شرکت کی اجازت نه تھی ' اس لئے که ان پر شہزادہ عثمان کے قتل میں حصه لینے کا شبه تھا ۔ چونکه خود سلطان بھی جانثاریوں کے پہلے دسته کا رکن سمجھا جاتا تھا ' اس لئے اس رسم کے چند روز بعد وہ جانثاری کی وردی پہن کر بارکوں میں جاتا اور تنخواہ لیتا تھا ' اور بارک کے دروازہ پر ۔ گھوڑا ٹھیرا کر جانثاریوں کے افسر کا دیا هوا شربت کا پیاله پیتا ' جس کا مطلب یه هوتا که اسے ان کی وفاداری پر

پورا پورا اعتماد ہے —

اس مخصوص فوج میں کسی باہر والے کو' اس صورت کے جب کہ اس میں کوئی خاص خصوصیت ہو ' شرکت کی اجازت نہ تھی۔ اگرچہ جانثاری افواج ' اپنی ترکیب کے لحاظ سے مخلوط تھیں ' لیکن ان کی حلقہ بندی اور رشتہ اتحاد مستحکم تھا ' البتہ سولہویں صدی کے آخر میں وہ بازیگر اور مسخرے بھی ' جو اپنے کرتبوں سے شاہی محفلوں میں سلطان کی خوشنودی حاصل کر لیتے ' اس میں بھرتی کئے جانے لگے۔ اس کے بعد سے تو جانثاریوں کی بارکوں میں ہر قسم کے غیر معتبر بیرونی لوگ داخل ہونے لگے ' جس نے اس فوج کی روایتی یک جہتی اور شیرازہ بندی کو صدمہ پہونچایا ' اور ان کی جو خاص شان تھی اسے مٹا دیا۔ اب یہ لوگ شادیاں کرکے بارکوں کے باہر رہنے اور امن و امان کے زمانہ میں کوئی نہ کوئی کاروبار بھی کرنے لگے۔ غرض کہ وہی فوج جس کی بسالت اور ہیبت کی کسی زمانہ میں دھاک بیٹھی ہوئی تھی ' اب اس کی حیثیت صرف ایک شورش پسند اور شورہ پشت انبوہ کثیر کی سی ہو گئی ' جس سے ملک کے امن و امان کے لئے اندیشہ پیدا ہو چلا۔ لڑائی کے کام کے تو یہ لوگ بالکل رہے ہی نہیں ' اور جب کئی مرتبہ ان کی جدید تنظیم کی کوشش کی گئی لیکن ناکامی ہوئی تو آخر کار سنہ ۱۸۲۶ ع میں اس فوج کو بالکل ہی توڑ ڈالا گیا —

مذکورہ بالا باقاعدہ اور مستقل افواج کے علاوہ ' جاگیری امرا ' "تمار" "زیامت" اور ' خاص ' کی اپنی اپنی منتظم فوجیں بھی تھیں ' اور ان میں سے ہر ایک اپنی جاگیر کے شایان شان مسلح اور تربیت یافتہ سپاہ ' پیدل اور سوار ' معسکر سلطانی کو بھیجتا تھا۔ اپنے زمانۂ عروج میں ' سلطنت عثمانی ' بے خرخشہ اور صرف ایک لاکھ چالیس ہزار سوار میدان جنگ

میں لا سکتی تھی - نپولین کی جنگوں کے زمانہ تک یورپ کی کوئی سلطنت اتنا تعدی دل لشکر جمع نہ کر سکتی تھی - امرا کو جاگیریں خدمات سلطانی کے صلے کے طور پر عطا ہوتی تھیں، جن میں سے بعض تو حین حیات کے لئے ہوتیں' اور بعض ہمیشہ کے لئے اور موروثی - یورپ میں تو جاگیری نظام اپنے غیر منفک موروثی حقوق کی وجہ سے مرکزی حکومت کے لئے خطرناک بن گیا تھا' لیکن ترکی کے امرا اور جاگیردار ہمیشہ اپنے بادشاہ کے پابند اور ماتحت رہا کرتے تھے - لیکن عثمانی سلطنت کو اپنے جاگیری نظام کی وجہ سے جو قوت حاصل ہوئی تھی' اس میں عام اخلاقی زوال اور بد ضبطی کی وجہ سے ضعف پیدا ہو گیا - بیگمات کے اثر اور رسوخ کی وجہ سے اکثر غیر مستحق لوگوں کو جاگیریں ملنے لگیں اور اکثر امرا اپنی جاگیروں سے دور بیٹھکر مزے کرنے لگے - جاگیروں کو پٹہ پر دینے کا دستور عام ہو گیا' اور اس نے اکثر جاگیرداروں کو تباہ کر دیا - کھیتوں سے کمال بے پروائی کے ساتھہ زیادہ سے زیادہ انتفاع کیاجانے لگا' نتیجہ یہ ہوا کہ اراضی بنجر اور مردہ ہو گئی اور سارے ملک میں غلہ کی قلت ہو گئی - ترکی فوج کا بیشتر حصہ جانثاری اور جاگیری سپاہ پر مشتمل تھا - طلایہ یادوسری معمولی خدمات کے لئے بے قاعدہ اور عارضی سپاہ استعمال کی جاتی تھی ان کے پاس بندوقیں ہوتی تھیں' یا پھر سرنگیں بچھانے یا لشکر گاہ یا قلعوں میں خندقیں کھودنے کا کام ان کے تفویض ہوتا تھا - چونکہ بلقان کے مفتوحہ علاقوں کو بھی امدادی فوجیں بھیجنی پڑتی تھیں' اس لئے ان میں سے اکثر عیسائی ہوتے تھے

چونکہ سولھویں صدی میں سارا " بحرقلزم " ترکوں ھی کے زیر اثر تھا' اس لئے ان میں بحری فاتحین اور امیرالبحروں کا بھی ایک لا جواب جھگڑا پیدا ہوا' مثلاً " خیر الدین بار بروسا " اور اس کا بیٹا " حسن " ' پیالہ تو غدن'

' صالم رئیس ' اور ' پیری رئیس ' سب سے پہلا جہازی کارخانہ (ترسانہ) ' گیلی پولی ' میں کھولا گیا تھا ' جو ' سلیمان ' کے عہد میں ' شاخ زرین ' کو منتقل کر دیا گیا - ' قاپودان پاشا ' یعنی امیرالبحر کا منصب صدراعظم کے بعد ھی ھوتا تھا - ترکی کے تمام بحری افسر اور ملاح عیسائی والدین کی اولاد تھے - یہ تو ھر شخص جانتا ھے کہ ان لوگوں نے اپنے بہادرانہ کارناموں سے یورپ کو کس قدر سراسیمہ کر دیا تھا ' لیکن اس کے علاوہ ان میں بعض بہت قابل ھوئے ھیں اور سائنس دان مصنفین کی حیثیت سے بھی مشہور ھیں' مثلاًپیری رئیس نے بحیرہ ایجین اور بحیرہ روم کا ایک بحری نقشہ (بحریہ) تیار کیا تھا - وہ ان دونوں سمندروں کا چپہ چپہ چھانے ھوا تھا' اور اپنے نقشہ میں اس نے بحري روؤں' مختلف مقامات کی گہرائیوں' اترنے کی جگہوں اور بندرگاھوں کے متعلق جملہ معلومات فراھم کی ھیں - اسی طرح سے ایک اور علمی ذوق رکھنے والا امیرالبحر سیدی علی تھا' جس کا جہاز باد مخالف کی وجہ سے ھندوستان کے ساحل پر آن لگا تھا' وہ خشکی کے راستہ' یعنی سندہ' خراسان' بلوچستان اور ایران ھوتا ھوا ترکی واپس گیا تھا - اس نے اپنے اس رسالہ سفر کی واردات لکھی ھے اور ساتھہ ھی اصطرلاب کے استعمال پر ایک ھندسہ کی کتاب' اور ھندوستان کے سمندروں پر ایک کتاب " محیط " کا مصنف بھی ھے —

ترکی نے اپنے اعلیٰ درجہ کے منظم جہازی کارخانوں کی مدد سے ایک ایسا بیڑا تیار کرلیا تھا جس میں ھر خدمت کے لئے خاص طور پر تربیت یافتہ ملاح اور سپاھی' مامور تھے' ان کی ایک جماعت کو جاگیری حقیت اراضی کے طریقہ کی رو سے بحری خدمات انجام دینی پڑتی تھیں - غلاموں' قیدیوں اور سزا یافتہ مجرموں سے جہازوں کی مرمت اور دیکھہ بھال کا کام لیا جاتا تھا' اور ان سے غلاموں کا سا سلوک کیا جاتا تھا - دوسری اقوام کی فوجوں کے بر خلاف' ترکی

فوج کی وردیاں شوخ رنگ کی ہوا کرتی تھیں ۔ چونکہ اس زمانہ میں لڑائیاں دست بدست ہوا کرتی تھیں، اس لئے خاکی وردی سے غنیم کو دھوکا دینے کی کوئی ضرورت نہ تھی ۔ وردی میں سر کا لباس خاص طور پر نمایاں ہوتا تھا۔ شلواریں، جن کی پنڈلیوں کے اوپر مختلف رنگوں کے تسمے بندھے رہتے تھے اور یہ ایڑی کے پنڈلیوں تک کے جوتے جن کے ادھر ادھر بٹن ٹکے رہتے تھے ۔ ان سے لمبے دھاوے مارنے میں سہولت ہوتی تھی ۔ کوچ کی حالت میں لبادے کے دامن کمر پیٹی میں اٹکا لئے جاتے تھے تاکہ چلنے میں آسانی ہو —

عثمانیوں کے اسلحہ میں ایشیائی اسلحہ جیسے گرز، بسولے، تلواریں اور یورپی آتشیں اسلحہ دونوں مستعمل تھے ۔ آتشیں اسلحہ میں سب سے پہلے توپوں کا استعمال شروع ہوا ۔ اس کے بعد رائفلیں، جن کو سب سے پہلے جنگ کو سوو

(Kossowo) سنہ ۱۳۸۹ ع میں استعمال کیا گیا تھا ۔ لیکن عثمانی، جو اپنی فوج کی اصلاح کے لئے غیر ملکیوں کو ملازم رکھتے تھے، بھاری بھاری توپیں ڈھالنے میں اپنے دشمنوں سے بہت آگے تھے سوار فوج کے حملہ کی مدافعت کے لئے وہ گھومنے والی توپیں اور ایک قسم کی مشین گنیں استعمال کرتے تھے —

جب اعلان جنگ ہوتا، تو مختلف پلٹنیں مقررہ مقامات پر جمع ہوتیں۔ مغرب کی طرف جو لڑائیاں ہوتیں، ان کے لئے کوچ کا راستہ ادرنہ، سوفیا، نش اور بلغراد تھا ۔ روس کی طرف ادرنہ، سوفیا، بداداغی، عراقچی اور دریاے نیس ٹر (Dniestor) کے کنارے کنارے کوچ کیا جاتا ۔ فوج کے لئے غلہ اور رسد کے ذخائر مہیا کرنے کے لئے بعض شاہراہوں کو اختیار کیا جاتا ۔ ان سب راستوں کے پہلے ہی سے متعین ہونے کی وجہ سے اس کا اندازہ ہوجاتا تھا کہ معرکہ کہاں ہوگا

یہ میدان جنگ عموماً ایسے وسیع میدان ہوا کرتے تھے جن کے چاروں طرف پہاڑیاں ہوتیں اور ہر فریق ان پر پہلے قابض ہونے کی کوشش کرتا تھا - ترکی فوجیں زمین پر لیٹ کر پیٹ کے بل چلتی تھیں اور اس لئے انہیں بعض مقررہ راستوں پر رہنا پڑتا تھا - جب فوج جنگ کے لئے روانہ ہوتی تو اس کے ساتھہ رسد پہونچانے والوں، مزدوروں، مغنیوں اور بازیگروں کا ایک جم غفیر ہوتا تھا - ترکی لشکر گاہ میں عجب رونق اور چہل پہل ہوتی تھی - دنیا کے ہر حصہ کی نسلیں اور لباس وہاں نظر آتے، اور ایسا معلوم ہوتا کہ جیسے کسی مشرقی شہر کا سارا بازار اپنے طرح طرح کے سامان اور تماشوں کے ساتھہ، فوج کے ہمراہ جارہا ہے- مشرق نے بلقان کے راستہ سے وی اینا (Vienna) کے کئی چکر اس طرح لگائے ہیں —

ترکوں کے حربی اصول، قدرتی طور پر، ان کے مخصوص فوجی نظام پر مبنی ہوتے تھے، اور ابھی زمانۂ حال تک ان میں وسط ایشیا کے میدانوں کی زندگی کے چربے نظر آتے تھے - شروع شروع میں تورانی اقوام نے قدیم ایرانیوں سے، جنہوں نے پیادہ اور سوار فوج میں اتحاد عمل کا ایک مخصوص طریقہ نکالا تھا، یہ حربی اصول سیکھا تھا کہ فوجوں کو کھڑی قطاروں کی بجائے صف میں پھیلا دیا جائے- ترکوں کی صف بندی اس طریقہ پر ہوتی کہ قلب میں تو پیدل سپاہ کا ایک مستحکم مرکز ہوتا جس کے آگے توپخانہ ہوتا اور میمنہ اور میسرہ میں سواروں کے دستے رکھے جاتے - لڑائی اس طرح شروع ہوتی کہ پہلے سامنے کی طرف سے بے قاعدہ رسالہ (آقنچی) چھاپے مارنا شروع کرتا، اور پھر جنگ مغلوبہ کے اصول پر اپنے کو شکست خوردہ ظاہر کرنے بے تحاشا بھاگتا - غنیم زعم میں آکر اس کا تعاقب کرتا، یہاں تک کہ توپخانہ کے نیم دائرہ کی زد میں آجاتا، اب بے قاعدہ سواروں کے دستے (جنہوں نے چھاپہ مارا تھا) تو دائیں بائیں پھیل جاتے اور دفعتاً توپخانہ غنیم پر باڑھیں مارنا شروع کرتا - ساتھہ ہی میمنہ اور میسرہ کے رسالے کے دستے چکر کاٹ کر اسے منتشر کردیتے اور دوسری طرف سے جانباز

جانثاری پیدل فوج شکست خوردہ غنیم پر ٹوٹ کر اور تعاقب کرکے ان کا کام تمام کردیتی - اگر یہ حربی چالیں کارگر ہوتیں، تو پوری طرح سے فتح حاصل ہو تی اور میدان جنگ ہی میں غنیم کا کام تمام ہو جاتا - ترکوں نے اس طرح سے ایک ایک معرکہ میں سلطنتوں کی قسمت کے فیصلے کر دئے ہیں - ترک پیدائشی سپاہی ہیں، اور جب انیسویں صدی میں یورپی تہذیب نے لمبی مار کے آتشیں اسلحہ تیار کئے اور پرانی حربی چالیں بے کار ہو گئیں، تو ترکوں نے نئے اصولوں کو بھی نہایت مستعدی کے ساتھ سیکھ لیا، اور ان میں بھی اگر دوسری قوموں کے آگے نہیں، تو کم از کم ان کے برابر وہ ضرور ہوگئے - ترک ہی اسلام کے بہترین مجاہد اور مبارز ہیں، اور ان میں آج بھی اعلیٰ درجہ کی خدا داد فوجی قابلیت رکھنے والے لوگ پیدا ہوتے رہتے ہیں —

عثمانی سلطنت کا اگر کوئی کمزور ترین رخ تھا، تو وہ مالیات کا انتظام تھا، گویا کہ فطرت کا تقاضہ ہی یہ ہے کہ سپاہی اقتصادیات سے بے بہرہ ہو، وہ کبھی سلطنت کے محاصل اور مخارج کی میزان برابر نہ کر سکے - ان کے یہاں کوئی باضابطہ میزانیہ تیار نہیں کیا جاتا تھا، اور سلطان کی طبیعت کی لہر مالیات کی مستحکم ترین بنیادوں کو متزلزل کردیتی تھی - شریعت اسلامی کے بموجب ریاست کی آمدنی کی مدیں عشر، نمک کے محصول، جزیہ، مفتوحہ یا ماتحت دول کے خراج اور مال غنیمت کا خمس ہوتی تھیں، سلطنت کے عروج کے زمانہ میں محاصل مخارج سے کہیں زیادہ ہوا کرتے تھے، اس کے بعد یہ دستور ہو گیا کہ ہر سلطان تخت نشینی کے وقت جا نثاری فوجوں کو بڑی بڑی رقمیں تقسیم کرنے لگا اور حرم سرا کے اخراجات بے تکان بڑھنے لگے - آمد و خرچ کا کھاتہ رکھنے کا تو کوئی طریقہ تھا ہی نہیں، صوبجات کا پیسہ پیسہ کھینچ لیا گیا اور

وہ مفلس ہو گئے، اور جب نیا دور تمدن شروع ہوا تو چونکہ ترکی زراعتی ملک تھا، اس لئے اسے اپنی مصنوعات باہر والوں سے خریدنی پڑیں۔ اگرچہ 'سلیمان' "ذی شان" کے زمانہ میں ترکی اوج کمال پر تھا، لیکن مالی مشکلات اسی زمانہ میں شروع ہو گئی تھیں۔ جاگیری حقیت کو وقف میں منتقل کر دیا گیا تھا اور زمین کو پٹہ پر دینے کا طریقہ شروع کر دیا گیا تھا۔ باضابطہ میزانیہ تیار کرنے کی کوشش پہلی مرتبہ سنہ ۱۶۰۹ ع میں کی گئی، پھر سنہ ۱۶۵۳ ع میں اور اس کے بعد سنہ ۱۶۶۰ ع میں —

اس زمانہ میں دو 'قوپ رولو' * کے حسن انتظام سے مالیہ کی حالت کچھ سنبھلی، میزانیہ شکل سنہ ۱۸۶۲ ع تک وہی رہی، اس سال البتہ 'فواد پاشا' نے ملک کی مالی حالت کے متعلق جو رپورٹ پیش کی، اس کے ساتھ ایک باضابطہ میزانیہ بھی شریک کیا۔ یہ میزانئے کبھی صحیح نہیں ہوتے تھے اور کم عیار سکوں کی گردش اور سرکاری طور پر ضبطی جائداد کی کار روائیوں نے حکومت پر سے رعایا کا اعتبار بالکل اٹھا لیا تھا۔

لیکن جب ہم ترکوں کے علوم و فنون اور خالص اسلامی تہذیب کی ترقی میں ان کا جو کچھ حصہ تھا، اس پر نظر ڈالتے ہیں، تو مذکورہ بالا ابتری کی کسی قدر تلافی ہو جاتی ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ ترکوں کی طبیعت میں، کسی طرح کی جدت طرازی نہ تھی، تاہم ماننا پڑتا ہے کہ وہ ہمیشہ علم کے شیدائی اور دوسری اقوام کے ہونہار شاگرد رہے ہیں۔ ترکی علماء عجمی اور عربی تمدن پر گہری نظر رکھتے تھے، اور چونکہ

---

* یعنی ایک تو 'قوپرو لی محمد' جو سنہ ۱۶۵۶ ع میں صدر اعظم ہوا تھا، اور دوسرا اس کا بیٹا 'قوپرولی زادہ احمد' جو سنہ ۱۶۶۱ ع میں وزیر ہوا۔ یہ دونوں البانی الاصل تھے۔ ۱۲ — مترجم

ازمنہ وسطیٰ میں علم کا مطلب ہی " علم دین " ہوتا تھا ' اس لئے اسلامی دینیات کے مطالعہ کا شوق بہت جلد ترکوں میں پیدا ہو گیا - ان کے ابتدائی زمانہ کے سلاطین مسجدیں اور ان کے قریب مدرسہ تعمیر کراتے تھے ' جہاں ستونوں کے سامنے زمین پر دو زانو بیٹھکر ' ترکی شاگرد عربی کا نصاب پڑھا کرتے تھے - جنھیں اعلیٰ تر تعلیم مطلوب ہوتی وہ ' مصر ' کے مشہور زمانہ مدارس میں جا کر تعلیم حاصل کرتے تھے - جس طرح سے اس زمانہ میں یورپ میں درس و تدریس لاطینی میں ہوتی تھی ' اسی طرح ممالک اسلامی کی علمی زبان عربی تھی ' اس کی وجہ سے مختلف تمدنوں کے درمیان ایک طرح کا بین الاقوامی رشتہ اتحاد پیدا ہو جاتا تھا ' جو آج کل اس وجہ سے نہیں پیدا ہوتا کہ " قومی زبان " کے شوق نے ہر ایک کی حد الگ الگ کردی ہے - شروع زمانہ کے ترکی علماء میں ' شیخ اودے بلی ' جو سلطان ' عثمان ' کا خسر تھا ' ' درسون فاقی ' ' چندرالی قارا خلیل ' وغیرہ قابل ذکر ہیں ' اس کے بعد ' ازنک ' کے مدرسہ نے شہرت حاصل کی جو سلطان ' اور خان ' کا قائم کیا ہوا تھا - ادرنہ اور ' قسطنطنیہ ' کی تسخیر کے بعد مختلف سلاطین نے ان دونوں مقامات میں لاجواب مسجدیں اور مدرسے بنائے جن میں ' ادرنہ ' میں سلیم کے بنائے ہوے مدرسہ کو اور ' قسطنطنیہ کے مدرسہ ' سلیمانی ' کو خصوصیت کے ساتھہ علمی مرجعیت حاصل تھی ' اور دور دور کے طلبہ وہاں تحصیل علم کے لئے آتے تھے - اساتذہ میں ' عسکرے لی جمال الدین ' اور ' سعدالدین تفتازانی ' بہت مشہور تھے ' جن کی تفاسیر آج تک اسلامی مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں - ' شیخ بدرالدین ' نے تصوف پر کئی قابل قدر کتابیں تصنیف کیں ' وہ اپنے ہم عصروں میں اپنے آزادانہ فلسفیانہ رجحانات و خیالات کی وجہ سے ممتاز ہیں - ' محمد فاتح ' کے عہد

میں ' ملا خسرو ' نے کتب فقہ کے مصنف کی حیثیت سے خاص شہرت حاصل کی -
فقہ میں ان کی کتاب " غرر " اور اس کی شرح " درر " بہت معروف
ہے - " سلیم اول " کے زمانہ میں " زمبلی علی جمالی " اور مفتی اعظم
" کمال پاشا زادہ " علم و فضل کا مرجع تھے اور علماء جوق جوق آکر
ان کے آگے زانوے شاگردی تہ کرتے تھے - اسی طرح " سلطان سلیمان " کا
عہد بھی " ابو سعود آفندی " اور " ابن کمال " جیسے صاحبان علم و فضل
پر بجا طور پر فخر کرسکتا ہے - " ابن کمال " نے تفسیر اور کمالیات
میں خاص شہرت حاصل کی تھی ' انھوں نے تاریخ پر بھی قلم اٹھایا ہے
اور شاعر بھی تھے - ان کی ذات جامع‌العلوم تھی اور وہ اپنے زمانہ
کے بزرگ ترین عالم سمجھے جاتے تھے - " ابن سعود " اپنے زمانہ
میں شریعت کے سب سے بڑے عالم تھے اور اسی حیثیت سے معروف
ہیں - عربی میں انھوں نے وہ زور قلم پیدا کیا تھا کہ کوئی اور
ترک ان کی برابری نہ کرسکتا تھا - یہ دونوں علماء یعنی ' ابوسعود ' اور
' ابن کمال ' آج تک بزم علم و فضل کے مسند نشیں ہیں - عثمانی سلطنت کے زوال کے
ساتھہ ساتھہ ترکوں کے قواے روحانیہ میں بھی انحطاط نمودار ہوگیا اور اگرچہ ابھی
کچھہ زمانہ اُدھر تک ترکی کے مدارس میں ' کمالیات ' کا چرچا تھا ' لیکن فکر وخیال
کی کوئی جدت ' یا فلسفہ ' کے میدان میں کوئی تازہ خیالی ہمیں نظر نہیں آتی -
دینیات اور فلسفہ کی ترقی آج بالکل رک گئی ہے —

سائنس کے شعبہ میں ' ترکوں نے سب سے پہلے فن طب میں ترقی کی -
قاموس‌المشاہیر میں ہزاروں نام ترکی‌النسل اطباء کے نظر آتے ہیں - سنگی تعمیر کا
سب سے پہلا شفاخانہ ' برو سامیں ' بایزید ' نے سنہ ۱۴۰۱ ع میں بنوایا تھا - اس کے
ساتھہ ایک مطب بھی تھا - ' مدرسہ سلیمانی ' اور مدرسہ مسجد فاتح '

میں بھی طب یونانی کی تحصیل ذوق و شوق سے کی جاتی تھی -
یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ اگرچہ علوم دینیہ و فلسفہ کی تحصیل کا ذریعہ عربی زبان ہی تھی ' لیکن کتب طب ترکی زبان میں لکھی جاتی تھیں - ترکوں نے دماغی امراض ' اور ارثی بیماریوں کے قوانین کی دریافت اور تحقیق کرکے فن طب کی خاص خدمت کی ہے - ان کے مشہور اطباء میں سے اسحاق اور حاجی پاشا (جنھوں نے بعض بلند پایہ علمی رسالے لکھے) " بایزید " کے زمانہ میں ہوے - اور محمد ' فاتح ' کے عہد میں ' التنجی زادہ ' ' خاویجی زادہ '' احمد' ' علی احمد چلبی ' ' وسیم عباس ' و غیرہم مشہور ہوے - فن جراحی میں ' خصوصاً کحال کی حیثیت سے ان لوگوں کی شہرت وسطی یورپ تک پہونچی ہوی تھی - دینیات اور طب کے علاوہ ' وقائع نویسی اور فن تاریخ میں بھی ترکی نے خاص مرتبہ پیدا کیا تھا - یہ صحیح ہے کہ ترکوں کے شعری سرمایہ کے مقابلہ میں ان کا سرمایۂ نثر نظر میں نہیں ' جچتا ' لیکن جہاں تک نثر کا تعلق ہے ان کا تاریخی سرمایہ ہی بہترین اور علمی حیثیت سے سب سے زیادہ قابل قدر ہے - شروع میں وہ ایرانی طرز تاریخ نویسی کی تقلید کرتے تھے ' لیکن بعد میں لفاظی اور عبارت آرائی کا شوق پیدا ہوگیا ' اور حسن الفاظ حجاب معنی بن گیا - یہ عیب آج تک باقی ہے - سلاطین بھی وقائع نویسی کی قدردانی کرتے تھے ' اس لئے کہ اس سے ان کے کار ناموں کو حیات جاوید ملتی تھی ' اور اگرچہ اکثر ترکی تاریخیں اسی یک طرفہ نقطہ نظر سے لکھی گئی ہیں ' لیکن اگر ان کے متن کی تحقیق اور تنقید کی جاے تو آج بھی ان سے بہت قابل قدر معلومات حاصل ہوسکتی ہے —

'عاشق پاشا زادہ' سب سے پہلا ترکی مورخ تھا - وہ 'بایزید ثانی' کے عہد میں

گزرا ہے، اور اپنے ہم عصر 'نشری' کی ''جہاں نما'' کی طرح، اس کی تصانیف میں بھی ترکوں کی لڑائیوں کا حال نہایت سلیس اور صاف زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ ' ادریس بطلیسی ' نے بھی ' ہشت بہشت ' کے عنوان سے فارسی میں ایک تاریخ لکھی ہے ' جس میں ادبی رنگ موجود ہے - پندرہویں اور سولھویں صدی عیسوی کے ترکی مورخین نے فتح ' قسطنطنیہ سے پہلے کے جو حالات لکھے ہیں ' وہ عثمانی شاہنشاہیت کے نقطہ نظر سے لکھے ہیں ' وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ترکوں کی ابتدا ایک دیہاتی جماعت سے ہوئی تھی ' اور وہ اناطولیہ میں اپنے حریفوں کو صرف اس وقت زیر کر سکے تھے جب " قسطنطنیہ " کی فتح کے بعد ان کا شمار دول عالم میں ہونے لگا تھا - " سلیمان " کے زمانے سے ہمیں ترکی تاریخوں میں مقفیٰ عبارت نظر آتی ہے ' جس سے ان کا مطلب مبہم ہو جاتا ہے۔ ان میں سے اکثر تو نرے قصیدے ہیں - سرکاری وقائع نویسوں کا سلسلہ " خوجہ سعدالدین صاحب تاج التواریخ" سے شروع ہوتا ہے ' انھوں نے " سلیم ثانی " کے عہد کی تاریخ لکھی ہے ' لیکن ان کا طرز تحریر نہایت مغلق اور بھونڈا ہے - ترکی تاریخوں میں نائمہ کی کتاب سب سے زیادہ مستند ہے ' اگر چہ اس کا طرز بیان بھی عیب سے خالی نہیں - دوسرے مورخین ' رشید محمد ' ' اسمعیل عاصم ' ' عزی سلیمان ' ' واصف احمد ' ' پچوی ' ' سلا نیک لی مصطفیٰ ' " علی آفندی " ' کاتب چلبی ' ' اور منجم باشی ' گزرے ہیں - ان سب نے تاریخ ترکی کے انقلاب آفریں واقعات پر نظر ڈالی ہے - ان کی جامع اور مبسوط تاریخوں کے علاوہ ' سیرت ' ادبیات ' حرم سرا کی زندگی وغیرہ پر علحدہ علحدہ رسائل بھی موجود ہیں ' مثلاً مصطفیٰ پاشا کی ' نتائج الوقوعات ' ' عطا بے ' کی ' اندرون تاریخی ' ' علی آفندی ' کی ' مناقب هنروران ' وغیرہ ' نتائج الوقوعات

میں صرف واقعہ نگاری ہی پر اکتفا نہیں کی گئی ہے بلکہ سلطنت کے نظم ونسق کی تصویر بھی کھینچی گئی ہے - ' اندرون تاریخی ' حرم سرا کی زندگی کا سچا خاکہ ہے ' اگرچہ اس کے طرز تحریر میں تصنع بہت زیادہ ہے - اور اکثر مقامات پر تو ادبیات کے درجہ سے گر کر اس کی حیثیت صرف تک بندی کی سی رہ جاتی ہے قوچی بے کی تاریخی اورنقادانہ تصنیف میں زوال سلطنت عثمانی کے اسباب نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں —

اس مختصر تبصرے میں ترکی جغرافیہ دانوں کا ذکر نہ کرنا ناانصافی ہو گا - حدود سلطنت کی وسعت خود جغرافیہ دانی اور جغرافی معلومات کی محرک تھی - اور سولھویں صدی کے بعد سے ہمیں ترکی زبان میں متعدد کتابیں جغرافیہ اور فن جہاز رانی پر نظر آتی ہیں - ان مصنفوں کے علاوہ جن کا ذکر اس سے قبل کیا جا چکا ہے ' ' سپاہ زادہ محمد ' اور " امیر محمد ابن حسن " نے سولھویں صدی میں امریکہ کے حالات پہلی مرتبہ ترکی زبان میں لکھے ہیں -

لیکن جو شخص باتفاق رائے ترکی کے باکمالوں کی بزم کا صدر ہے ' وہ ' کیاتب چلبی ' المعروف بہ ' حاجی خلیفہ ہے ' جس نے ' کشف الظنون ' کے عنوان سے ایک قاموس لکھی ہے - اس کے علاوہ فن جغرافیہ پر ایک کتاب ' جہاں نما ' بھی اسی کی تصنیف ہے - اطلاس خورد (Atlas minor) کا ترکی ترجمہ بھی اس نے کیا ہے ' نیز بحری جنگ پر کئی تالیفوں کا سہرا بھی اس کے سر ہے - ' رئیف محمد ' نے سلیم کے عہد میں (سنہ ۱۷۸۹ ع - سنہ ۱۸۰۷ ع) انگریزی زبان میں ایک جغرافیہ کی کتاب لکھی اور ایک اطلس (Atlas) مرتب کیا تھا —

ترکی ادبیات شروع ہی سے ترکی قوم کی دورخی زندگی کا عکس رہی ہے - حکمران اور تعلیم یافتہ طبقہ کو جمہور کی سادہ اور صاف زبان سے

نفرت تھی، اس لئے رفتہ رفتہ ایک مصنوعی زبان پیدا ہو گئی، جس میں فارسی اور عربی کے لغات کی اتنی بھرمار تھی کہ اس کا سمجھنا عوام کی قدرت سے باہر تھا - عثمانیوں کی نظر میں ادبیات کی اصطلاح سے یہی بھرتی کا اور مصنوعی طرز تحریر مراد لیا جاتا تھا جس میں فارسی کی بہت زیادہ تقلید کی جاتی تھی' اور عوام کے جذبات کا سچا اظہار اگر کہیں نظر آتا تھا' تو لوریوں یا "مدہ" کی کہانیوں میں' یا پھر "اورتا اوا‌ے نو" کے سوانگ میں' جو اس میں شک نہیں کہ بازنطینی سوانگوں سے ماخوذ تھا' لیکن ترکی جمہور کی زندگی اور ذہنیت کا سچا خاکہ تھا - چین سے کٹھ پتلیوں کا ناچ ایشیا ہوتا ہوا ترکی بھی پہونچ گیا تھا' اور اپنی اسلامی شکل میں بہت مقبول ہوتا تھا - ڈھلتی راتوں میں' باغوں کی بھینی بھینی خوشبوؤں' حقہ کی گڑ گڑاہٹ اور اعلی سے اعلی ترکی قہوہ کی سوندھی خوشبو کا مزہ لیتے ہوے' لوگ "مدہ" کی باتوں کو بڑے شوق سے سنتے اور اس کے ہاتھوں کے کرتب سے' نیز اس کی دلچسپ یا مضحک کہانیوں سے بہت کچھ لطف اندوز ہوتے تھے - حرم‌سرا کی خواتین چو بولے بناتیں اور تہوار کے موقعوں پر مذاقیہ طرز میں انہیں پڑھتیں - پرانی ترکی بحروں کے عام پسند گیت بھی صدیوں تک لوگوں کے دماغوں میں محفوظ اور زبانوں پر چڑھے رہے' اور بعض حلقے' مثلاً ایسویون یا بکتاشیوں کے' اپنے پر معنی گیت ترکی زبان میں بناتے تھے —

لیکن ان چند باقیات کو چھوڑ کر' تعلیم یافتہ ترکی طبقہ کی ادبیات عروض اور جذبات دونوں حیثیتوں سے غیر ملکی تھی - جیسے جیسے جمہور کی سیاسی اہمیت بڑھتی گئی اور وہ اپنے حقوق کے لئے جد و جہد کرنے

لگے ؛ ویسے ویسے ' ادبیات نے بھی آهستہ آهستہ عوام کے جذبات کا رنگ قبول کیا - ترکی سر زمین پر سب سے پہلے ' اور سب سے بہتر تصنیف جو ادبیات پر ہوئی وہ " جلال الدین " رومی (رح) کی فارسی مثنوی تھی ' جس کے صرف دو ترکی شعر شاعر کی ترکی قومیت کا پتہ دیتے ہیں - ان کے فرزند " سلطان ولید " ترکی میں شعر کہتے تھے ' لیکن عروض عجمی تھی - سلطنت عثمانیہ کے قیام و استحکام کے بعد ' " عاشق پاشا " نے " غریب نامہ " اور " سلیمان چلبی " نے " مولودی " خالص ترکی زبان میں لکھے ' لیکن فارسی ادبیات نے بہت جلد ان سر سری کوششوں پر غلبہ پالیا ' اور " سلطان محمد فاتح " ہی کے عہد میں ہم ترکی زبان کو مفرس اور ترکی ادبیات کو فارسی اصل کی نقل پاتے ہیں - بحیثیت مجموعی یہہ کہا جاسکتا ہے کہ افق ایران پر جب کبھی کوئی درخشاں ستارہ طلوع ہوا تو اس کی کرنیں ترکی ادبیات پر ضرور پڑیں - مدرسوں کی عربی تعلیم کا اثر بھی تعلیم یافتہ طبقہ کے ادبی ذوق پر بہت کچھہ پڑا - ترکی ادبیات گویا مسلم ایران کے خیالات کا ذخیرہ ہے - حرمسرائے سلطانی میں ایک خاص قسم کی ادبیات پیدا ہوئی ' جس کا موضوع تمامتر تصوف تھا اور جس میں پروانہ کی داستان عشق و سوز بیان کی جاتی تھی - دیوان مرتب کرنے کا عام طور پر دستور تھا ' جن میں قصائد ' مدحیہ اشعار ' مناجات اور غزلیات ہوتی تھیں - " سلیمان ذی شان " کے عہد میں اس مذهب ادبیات کا سب سے پہلا اور مشہور نمائندہ " فضولی بغدادی " ہوا ' جس کی زبان اگرچہ غیر شستہ دیہاتی ترکی ہے ' لیکن اس کا دیوان اور " لیلی مجنوں " اس کے شاعرانہ کمال کا ثبوت ہیں " فضولی " سے زیادہ مشہور شاعر اور (وہ بھی صرف شستگی زبان کے اعتبار سے) " باقی " ہوا '

جس کا زمانہ سترھویں صدی کا ھے اور جسے ترکی غزل گو شعرا کا سر تاج کہا جاتا ھے ' لیکن جدت طبع کے اعتبار سے " فضولی " کا رتبہ " باقی " سے بڑھا ھوا ھے - " باقی " کے ھم عصروں میں حسب ذیل مشہور ھیں - " ذاتی " (صاحب " شمع و پروانہ ") " لامعی " " روحی " اور " یحیی بے " (صاحب " شاہ و گدا ") - ترکی ادبیات کا طرز اور عام مذاق ھوبہو ایرانی اصل کی نقل تھا - تقلید اور تصنع کا یہہ رجحان سترھویں صدی میں بہت زیادہ بڑہ گیا تھا - " نفعی " اور اس کے معاصرین صرف صنائع لفظی پر جان دیتے تھے اور جذبات نگاری کی مطلق فکر نہ کرتے تھے - خصوصاً " نرگسی " نے تو اس بارہ میں اتنا مبالغہ کیا ھے کہ اس کا سارا کلام شاعری نہیں بلکہ محض رعایت لفظی ھے —

اٹھارویں صدی میں طرز ادا اتنا پیچ در پیچ ھوگیا تھا کہ بغیر مبسوط شرحوں کے شعر پڑھنا اور سمجھنا ممکن نہ تھا " ندیم " کا طرز ' جو غزل گو شعرا میں سب سے زیادہ رنگین بیان ھے ' البتہ کسی قدر صاف اور سادہ ھے - " راغب پاشا " فلسفیانہ شاعری کے نمائندے ھیں ' اور " فطنت خانم " اس عصر کے نسائی جذبات کی آئینہ دار ھیں - انیسویں صدی سے صاف اور سادہ شاعری کا دور شروع ھوتا ھے ' اور شیخ " غالب " (" محمد اسد ") کی مثنوی " حسن و عشق " اور ان کا دیوان متقدمین کی لفاظی اور لفظ بازیوں سے پاک نظر آتا ھے - دیوان مرتب کرنے کا مذاق بھی اسی زمانہ سے گھٹنا شروع ھوتا ھے ' اور " سنبل زادہ " - " وھبی " " سروری " اور " کے چی زادہ عزت ملا " اس رنگ کی ادبیات کے آخری نمائندہ ھیں - مصلح اعظم " سلطان محمود ثانی " کے زمانہ سے یہہ محسوس ھونا شروع ھوگیا کہ سلطنت عثمانی ' ذھنی اور مادی دونوں حیثیتوں سے زوال پذیر ھوتی جارھی ھے ۔

هم دیکھتے هیں که اس زمانه کے مشہور مدبرین سلطنت ' مثلاً " پرتو " اور " عاکف پاشا " اور ان کے بعد ' " عبدالمجید " " رفعت " اور " رشید پاشا " سرکاری سرا سلات کی مقفیٰ اور مرصع عبارتوں سے بہت بد دماغ هوتے تھے ' اور سلاست کی کوشش کرتے تھے - ادبیات میں بھی اسی قسم کا رجحان نظر آتا هے - ایک اور چیز جس نے ادبیات کے رخ اور مذاق کو دوسری طرف پھیر دیا ' ' یورپ ' کا اثر تھا ' جس کے ساتھه ترکوں کے براہ راست تعلقات ' نپولین ' کے زمانے سے پیدا هوچکے تھے - اس اثر سے ادبیات میں ایک امیدافزا نشاۃ ثانیه نمودار هوگئی —

جیسا که میں اس سے پہلے عرض کرچکا هوں ' ترکوں میں قدرت کی طرف سے تقلید اور اخاذیت کا ایک عجیب و غریب ملکه ودیعت کیا گیا هے ' جس کی وجه سے وہ دوسری اقوام کی روح اور کارناموں کو اپنے اندر جذب کرکے ان سے اپنے حسب مطلب کام لے سکتے هیں - ترکوں کی اس اخاذیت کی عظیم ترین یادگار ان کا فن تعمیر هے - سلجوقی ترک ایران اور شام هوکر آے تو اپنے ساتھه ' اناطولیه ' میں عربی ۸ ایرانی طرز تعمیر بھی لاے اور یہاں بازنطینی طرز سے مدد لیکر اس میں مزید ترقی کی - ترکوں نے ان مختلف نمونوں اور طرزوں کی محض کورا نه تقلید هی نہیں کی' بلکه ان کی طباعی نے ان اجزا سے ایک مخصوص ترکی فن تعمیر پیدا کردیا ' جو بذات خود عربی ' ایرانی اور یونانی فن تعمیر کی تمام حسین اور دلکش خصوصیات اپنے اندر رکھتا هے —

ترکی فن تعمیر کی سب سے پہلی یادگاریں ' ازنک ' اور ' بروسا ' میں ملتی هیں جو هونہار سلطنت عثمانی کا پہلا دارالخلافه تھا - یه زیادہ تر - سلجوقی طرز کی پبلک عمارتیں هیں ' مثلاً مسجد ' مدرسے ' مقبرے وغیرہ -

مسجدوں کی دیواروں اور گنبد میں سبز پتھر دیا گیا ہے ' جس کی وجہ سے
وہ " اخضر " کہلاتی ہیں ۔ سلجوقی تعمیر میں دروازوں پر کھدائی اور آرائش
کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا ۔ یاد رکھنا چاہئیے کہ ایشیاے کوچک کی نسبتاً سرد
آب و ہوا کی وجہ سے کھلے صحنوں میں محلے نہ بناے جاسکتے تھے ' اس لئے
بند دالانوں کی ضرورت پڑی اور دروازوں کی اہمیت زیادہ ہوگئی ۔ مسجدوں
کی دیواروں پر اعلیٰ درجے کے رنگین پتھر لگانے کا طریقہ ایرانی ہے اور ' بروسا '
اور 'از نک' کی مسجدوں میں بڑی یہی استعمال کیاگیا ہے ۔ مسجدوں کی مکانیت
کسی قدر کم ہوتی تھی اور چھتیں بغیر ستون کے بنائی جاتی تھیں ۔ چونکہ
ترک بڑی جگہ کے اوپر ایک گنبد نہ بناسکتے تھے ' اس لئے انھوں نے گنبد کی
تعداد زیادہ کرکے ان کا دور کم کردیا' لیکن چونکہ یہ سب گنبد ایک ہی سطح پر
ہوتے تھے جس سے بلندی کا اندازہ نہ ہوتا تھا ' اس لئے بہت جلد یہ ترمیم کردی
گئی کے بیچ کا گنبد ادھر ادھر کے گنبد سے اونچا بنایا جانے لگا —

ویسے تو بازنطینی طرز تعمیر کا اثر پہلے ہی سے بالواسطہ ترکوں پر پڑچکا
تھا ' لیکن فتح ' قسطنطنیہ کے بعد وہ اور نمایاں ہوگیا ۔ چونکہ سلطنت بہت
وسیع تھی اس لئے پبلک عمارات کی تعمیر کے لئے روپیہ کی کمی نہ تھی ' اور
پھر معاشرتی ضروریات کے روز افزوں اضافہ ' سے مسجدوں اور مقبروں کے علاوہ
دوسری عمارتوں کی بھی ضرورت پڑی مثلاً کنوے ' کاروان سرائیں ' بازار '
محلات وغیرہ ۔ ' ایا صوفیہ ' کا یونانی گرجا ترکی مساجد کے لئے نمونہ قرار
پایا اور ' مسجد بایزید ' ' مسجد شہزادہ ' ' مسجد سلیمانی ' ' مسجد سلطان احمد '
اور ' ینی جامع ' سب اسی نمونہ پر بنائیں گئیں ۔ ان سب عمارتوں کی
خصوصیت یہ ہے کہ بیچ میں ایک بڑا بلند گنبد ہوتا ہے جس کے گردوپیش
چھوٹے چھوٹے گنبد ہوتے ہیں اور یہ سب کے سب نہایت پائدار گول

ستونوں پر قائم ہوتے ہیں - دیواریں اتنی موٹی اور بھاری نہیں ہوتیں جتنی
کہ بازنطینی عمارتوں کی - محرابیں یا گول ہوتی تھیں یا نوکدار لیکن کشادہ
بہت ہوتی تھیں ستونوں کی کارنس پر خوشہ نما کام ہوتا تھا - اندرون مسجد
دالان در دالان ہوتے تھے اور اس کے پیچھے چھوٹی چھوٹی گمجیوں کے نیچے '
' عمارت خانہ ' یعنی طالب علموں کے حجرے ہوتے تھے —

بازنطینی گرجوں کے سنہری بتوں اور مقدس تصویروں کی بجائے' مسجد
کی اندرونی دیواروں پر عربی عبارتیں اور چاروں خلفاء کے نام کندہ ہوتے تھے -
ایک ترمیم ترکوں نے ایسی کی جس سے بازنطینی طرز کی عمارتوں کا حسن
دو بالا ہوگیا ' یعنی مینار کی تعمیر - عربی اور ایرانی طرز تعمیر میں میناروں
کی شکلیں مختلف ہیں ' مگر ترکوں نے اس میں اس طرح سادگی کی شان
پیدا کی کہ انھوں نے چکنے ' سڈول اور بلند مینار بنائے جن کی چھت بہت
سادہ ہوتی تھی ' البتہ برآمدوں پر گندھے ہوئے ہاروں کی طرح نقش و
نگار بناکر ان کی شان دو بالا کردی جاتی تھی - جزیرہ نمائے ' استامبول '
کے اس حصہ پر جو آگے کی طرف نکلا ہوا ہے اور جو اپنے محل وقوع کے
اعتبار سے دنیا کی بہترین جگہوں میں ہے ' ترکوں نے قدیمی بازنطینی محل
کے موقع پر ایک محل تعمیر کیا تھا - اس محل کی تاریخ خاصی طویل
ہے ' اس لئے کہ ہر سلطان نے اس میں متعدد عمارات کا اضافہ کیا ہے -
اس کے سب سے زیادہ قابل توجہ حصوں میں ایک تو حرم ہے جس کی
دیواروں پر پتھر کا کام لاجواب ہے ' اور دوسرا بغداد کو شک ہے جسے
' مراد چہارم ' نے دوبارہ بغداد فتح کرنے کے بعد تعمیر کیا تھا - ان عمارتوں
کے معمار زیادہ تر نو مسلم یونانی تھے - انھیں میں سے ایک مشہور معمار ' صنعان '
تھا جس کی تخلیقی قوت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس نے اپنی عمر میں کم و بیش

اسی (۸۰) مشہور پبلک عمارتیں بنائیں!

دنیاے اسلام میں ایک جامع مسجد ایسی بھی ہے جس کے چھ مینار ہیں۔ اسے ' سلطان احمد نے ' مشہور تاریخی رومی میدان پر ' تھیوڈوسیس ' (Thodosi us) کے مخروطی مینار (Obelisk) اور ' پلے ٹائیا ' (Plataia) کے میدان جنگ کے سامنے تعمیر کرایا تھا۔ اس کا معمار ' صنعان ' ہی کا ایک شاگرد ' محمد آغا ' تھا —

اٹھارویں صدی سے طرز تعمیر میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے: اس زمانے میں چاہات اور محلات بکثرت تعمیر ہوے' لیکن ان میں سے اکثریا تو نذر آتش ہوگئے' یا زلزلوں سے مسمار ہوگئے۔ 'احمد ثالث' کا بنوایا ہوا خوبصورت کنواں' اور مسجد نور عثمانی ' اور 'لالیلی جامع' جو دونوں حسین عمارتیں ہیں اسی زمانہ کی یادگاریں ہیں۔ ان عمارتوں کے کام میں ہمیں یورپی طرز تعمیر کا' جس کی خصوصیت یہ تھی کہ حد سے زیادہ نقش و نگار بنا دیے جاتے تھے — خفیف سا اثر نظر آتا ہے' بعد کو نقش و نگار کی اس افراط ہی کی وجہ سے فن تعمیر میں زوال پیدا ہوگیا انیسویں صدی کی عمارتیں تو بالکل ہی یورپی نمونوں کی نقل ہیں —

قسطنطنیہ' جس سے زیادہ خوبصورت موقع دنیا کے کسی اور شہر کو نصیب نہیں ہوا' بہت جلد 'شاخ زرین' کے دونوں کناروں پر پھیلنے اور بڑھنے لگا۔ لکڑی کی عمارتیں بننے لگیں جن کے منقش بالا خانے آگے کی طرف نکلے ہوتے تھے' اگرچہ یہ مکانات انسانی مسکن کی بجاے پرندوں کی کابکیں معلوم ہوتی تھیں' تاہم ان سے شہر میں ایک خاص شان اور بوقلمونی پیدا ہوگئی۔ جالی دار جھروکوں سے' جن کے پیچھے نازنیناں حرم رہا کرتی تھیں' خاموش اور پر سکون گلیوں میں ایک خاص پر اسرار کیفیت پیدا ہوتی تھی۔ امرا کے 'قونق' (محل) میں تو خیر بیش بہا قالین اور آرائش کی چیزیں ہوتی ہی تھیں' لیکن غریب سے غریب ترک بھی اپنے مکان کو صاف ستھرا اور قالین کے فرش سے آراستہ رکھتا تھا —

ہر اسلامی ملک کی طرح، ترکی میں بھی خاندانی معاشرت کی یہ خصوصیت تھی کہ عورت اور مرد الگ الگ رہتے تھے - جب سلاطین کا اقتدار بہت بڑھ گیا تو امرا کے گھرانوں میں شادیاں کرنے کی بجائے وہ اکثر لونڈیوں کو اپنے حبالہ عقد میں لاتے تھے، اور ان سے اولادیں پیدا ہوتی تھیں - لیکن یہ رسم امرائے سلطنت نے اختیار نہیں کی، وہ حسب دستور، شادی بیاہ کے قدیم طریقوں پر قائم رہے، اگرچہ غلاموں اور لونڈیوں کی کثیر تعداد کا رکھنا ان کے یہاں بھی فیشن میں داخل ہوگیا تھا —

ترکوں کی معاشرتی زندگی کے دو رخ ہوگئے تھے - مرد قہوہ خانوں میں بیٹھکر شعر شاعری یا قصہ خوانی سے اپنا دل بہلاتے تھے، عورتیں جمعہ کے روز کشتیوں میں بیٹھکر باغوں اور پھلواریوں میں تفریح کے لئے جایا کرتیں - شعر خوانی، موسیقی، اور ریشم اور سمور کے قیمتی لباسوں کی نمائش سے ان سیروں کا لطف اور دو بالا ہوجاتا تھا —

ترکی معاشرت کی اقتصادی بنیاد زمین اور اس کی پیداوار تھی - جاگیریں اسامیوں کو پٹہ پر دی جاتیں اور ان کی نگرانی بہت مشقت سے کی جاتی - یہی آبادی کی خوراک کا ذریعہ تھیں - زراعت کے علاوہ، صنعت و حرفت میں بھی، خصوصاً ایسی صنعتیں جن سے فوجی اغراض اور مشرقی زندگی کی ضروریات پوری ہوتیں، بہت جلد ترقی ہوئی، اور یہی شہری باشندوں کا وسیلہ معاش تھیں - ہر قسم کے صناعوں کی اپنی علحدہ علحدہ پنچائتیں تھیں، اور مختلف اہل حرفہ خود کو خاص خاص پیروں سے منسوب کرتے تھے - اولیاے چلبی نے جو سترویں صدی میں ترکوں کا سب سے بڑا سیاح ہوا ہے، پنچائتوں کے ایک جلوس کا نہایت مفصل حال لکھا ہے، ان میں ہمیں بعض ایسے پیشے بھی نظر آتے ہیں جو آج ممنوع ہیں - بازار میں چمڑے، ٹین، تانبے، اون اور ریشم کا ہمہ قسم کا مشرقی سامان موجود رہتا، جو یا تو خود ترکی کا بنا ہوا ہوتا، یا پھر کاروانوں کے ذریعہ دنیا کے ہر

حصہ سے لایا جاتا - جنووا (Genoa) اور وینس (Venice) کے تجارتی بیڑے ایشیا اور یورپ کے سامان کی تجارت کرتے تھے - ترک بحری تجارت کی طرف سے غافل تھے انہوں نے اسے غیر ملکیوں یا اپنی عیسائی رعایا کے اوپر چھوڑ دیا تھا —

ترک بالطبع سپاہی اور منتظم، منصف مزاج، اور امن و امان کا محافظ تھا - اس کی ساری دولت، یا تو اس کی اپنی املاک ہوتی، یا پھر ذاتی تنخواہ - عیسائی رعایا تجارت کے تمام منافع اور شعبوں پر قبضہ کرکے اتنی متمول ہوگئی تھی کہ مسلمان رعایا جن کی اولادیں سلطنت کی حفاظت کے لئے میدان جنگ میں سر کٹاتی تھیں ان کو رشک اور حسد کی نظروں سے دیکھنے لگی تھی - عیسائی فوجی خدمات سے مستثنیٰ تھے، جس کا بار سب سے زیادہ مسلمان ترکوں ہی کے اوپر تھا - اور جس شجاعت، اور حکم الٰہی کی سچی اطاعت کے ساتھ یہ مسلمان ترک اس بار کو اٹھاتے تھے، وہ مستحق صد هزار آفریں ہے - یہی لوگ اسلام کے بہادر ترین مجاہد تھے اور ایسے زمانہ میں جب کوئی اور مسلمان قوم یورپ کی چیرہ دستیوں کی تاب نہ لاسکتی تھی، اسلامی تہذیب، اسلامی علوم و فنون، اسلامی ادبیات، اور اسلامی زندگی کی خدمت کرنے والے اور اسے زندہ رکھنے والے یہی ترک تھے - اپنے کارناموں سے انہوں نے ثبات عزم اور قوت ارادی کی ایسی مثال دنیا کے سامنے پیش کردی ہے کہ اگر دوسری مسلمان قومیں اسے سمجھیں اور تہذیب اور تمدن کے شعبوں میں اس سے کام لیں، تو ان میں خودی کا احساس اور خود اعتمادی کی صفت پیدا ہوجائے

ترکی ادبیات کا احیاء

(۲)

سنہ ۱۸۲۶ ع کا ایک نہایت ابر آلود اور تاریک دن تھا ۔ قصر توپ قاپو میں ، جو قسطنطنیہ میں نہایت پر فضا جگہ پر واقع ہے ، سلطان محمود ثانی نے اپنی سلطنت کے مدبرین ، علماء اور فوجی افسروں کو جمع کیا اور ترکی کے افسوس ناک حالات کے متعلق ان سے گفتگو کی ۔ ملک سرکش ہو چلا تھا ، اور فوج ہزیمت خوردہ ، نظم و نسق ابتر تھا ، اور رعایا مفلوک الحال ۔ سرکش جانثاری افواج سلطنت کی بربادی کے درپے تھیں ، اور کسی میں اتنی جرات نہ تھی کہ ان کی سرکوبی کرے ۔ اس عالم یاس و نا امیدی میں ایک شخص عبدالرحمن آفندی اپنی جگہ سے اٹھا ، اور ایک مختصر لیکن دل ہلا دینے والی تقریر کی ۔ دوران تقریر میں وفور جوش سے اس کی تسبیح اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر میز پر گر پڑی اور اس کے دانے بکھر گئے ۔ اس نے کہا :—

" اگر خدا کی مرضی یہی ہے کہ ہمارا مذہب "

" اور ہماری سلطنت قائم رہے ' تو ہم ان بدکرداروں "
" کا قلع قمع کردیں گے ' نہیں تو اپنی سلطنت "
" اور اپنے مذہب کے نام پر خود قربان ہو جائیں گے "

اس کی یہ تقریر اپنا اثر دکھا گئی - تامل اور پس و پیش کی جو حالت پہلے تھی وہ جاتی رہی اور چند ہی روز میں ' ات میدان ' پر چن چن کر ایک ایک جانثاری قتل کردیا گیا ---

اسی واقعہ سے ترکی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے - پہلے یہ جانثاری عثمانی شوکت و عظمت کی بنیاد اور اس کے ستون تھے ' لیکن بعد کو یہی سلطنت کے حق میں سب سے زیادہ پر خطر بن گئے تھے ' اور جب ترکی جمہور نیند سے چونکی اور اس میں خودی کا احساس پیدا ہوا تو اس نے مستقبل کی بنیادیں رکھنے کے لئے ماضی کو مسمار کرنے میں ذرا تامل نہیں کیا - ترکی قوم نے جس طرح اپنے دل کو سخت اور ارادہ کو مضبوط بنا کر جانثاریوں کو قتل کیا ہے ' وہ ان کی آئندہ کی تاریخ کے لئے بطور ایک مثال کے ہے ' اور اس کے بعد سے ہم ہمیشہ یہی دیکھتے ہیں کہ ترکوں نے اپنی مٹی ہوئی عظمت اور شوکت کے کھنڈروں ہی پر ایک تازہ روح اور ایک نئی زندگی کی بنیادیں رکھی ہیں - اگر کسی قوم کی تاریخ محض درباری سازشوں ' سیاسی ناکامیوں ' اور میدان جنگ میں شکست کھانے کی کہتونی نہیں ' بلکہ جمہور کی روحانی زندگی اور تخلیقی قوت ارادی کی داستان ہوتی ہے ' تو ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ ترکی تاریخ بھی زوال کی راہ کہانی نہیں ' بلکہ ایک مقررہ منزل مقصود کی طرف برابر ترقی کرتے رہنے کی روئداد ہے - اس میں شک نہیں کہ پچھلی صدی میں یکے بعد دیگرے متعدد صوبے ترکی کے ہاتھ سے نکل گئے '

لیکن اس کے سپوتوں نے لڑائی کے میدانوں میں ایسی ایسی جیوٹ دکھا ی
کہ ان کے جانی دشمن بھی ان کا لوھا مان گئے، اگر ایک طرف ترکوں
نے ظالم یورپ کے سیاسی حوصلوں کا مقابلہ تلوار سے کیا، تو دوسری طرف
ان کی ذھانت اور فراست نے ماضی کے نقوش کو ذھنوں سے محو کرکے،
یورپ کے مایۂ ناز مفکرین، شعراء اور نغز گویوں کی روح کو اپنے اندر
جذب کرلیا - ترکوں کی یہ جنگ مذھب کے واسطے نہیں، بلکہ آزادی اور
حریت کے لئے تھی، جس میں کمال ھمت اور استقلال سے کام لے کر عہد
رفتہ کے بہتر سے بہتر سرمایہ کو مستقبل کے فائدہ کے لئے بے دریغ
قربان کردیا گیا —

ترکوں کی نشاۃ ثانیہ اور ترکی ادبیات کا تجدد مشرق کی تاریخ کا
ایک عجیب و غریب واقعہ ھے - ترکوں کے پاس پہلے ھی سے ادبی سرمایہ
موجود تھا، جو اُن کی تاریخ اور ان کے نظم معاشرت سے بہت قریبی مناسبت
رکھتا تھا، لیکن بعد کو جب سلطنت کے اختلال کے بعد پرانی معاشرت کا چولا بدلا،
تو لوگوں میں ایک دوسرا ھی ذوق اور ایک جدید روح پیدا ھوگئی، جس نے انہیں
تہذیب و شائستگی کے میدان میں آئندہ نئی نئی جولانیوں کے لئے
تیار کردیا - سلطنت عثمانی کو بے شک زوال ھوا، لیکن جمہور کی روح
مردہ نہیں ھوئی —

قدیم ترکی ادبیات کی جڑیں اس زمانے کی معاشرت کی گہرائیوں تک پہنچی
ھوی تھیں - اس ادب کا مرکز اور محور خاص خاص شخصیتیں ھوا کرتی تھیں - قصر
شاھی، سلطان اور اس کے ندماء – یہی شعراء و مصنفین کے سرپرست اور ان کا
ماوی اور ملجاء تھے، اس لئے ادبیات میں بھی انھی کی تحریک کام
کرتی تھی - چونکہ رعایا کی حیثیت محض طبقہ اعلیٰ کے ایک اقتصادی

آلہ کار کی سی تھی ' اور لفظ " قوم " کا اطلاق ان پر نہ ہوسکتا تھا ' اس لئے ادبیات کا روے سخن بھی ان کی طرف نہ تھا ' اور ان کے مذاق اور ان کی ضروریات کا اس میں کوئی لحاظ نہ رکھا جاتا تھا —

قدیم ترکی ادبیات کا محور مذھبی الہامات ھوا کرتے تھے - شعراء کے کے دواوین اگر ایک طرف بنی نوع انسان کے اعلی سے اعلی اور شریفانہ جذبات کے راگ گاتے تھے ' تو دوسری طرف ھوس‌ناکی کی پستیاں بھی ان میں اکثر نظر آتي تھیں - تصوف کو اعلی سے اعلی یا بدتر سے بدتر معنے پنھانا محض مصنفین یا قارئین کے ذوق پر منحصر تھا - نامق کمال نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ دواوین سے جو شیطانی خیالات پیدا ھوگئے ھیں ' ان کی بنا پر یہ قیاس کرنا کچھہ زیادہ نا مناسب نہیں ھے کہ لفظ دیوان فارسی " دیو " سے نکلا ھے —

پرانا ترکی ادب محض مصنوعی اور تقلیدی تھا - اس میں معنی آفرینی کے بجاے سارا زور فکر صنایع لفظی پر صرف کیا جاتا تھا - ایسے دور از کار استعارے جو صرف انھیں لوگوں کی سمجھہ میں آسکتے یا پسند ھوتے تھے جو زبان کی باریکیوں سے واقف ھوں ' اس ادب کا مایۂ ناز تھے - ظاھر ھے کہ ایسا طرز نبھنے والا نہیں ھوتا - اس میں ترقی کی صلاحیت نہیں ھوتی ' نتیجہ یہ ھوا کہ بند پانی کی طرح یہ ادبیات بھی صرف چند مخصوص طبقوں میں محصور ھوکر رہ گئی - نثر کا ادب تو اس خصوصیت میں نظم سے بھی بدتر تھا ' اس لئے کہ بحر و قوافی کی پابندیاں پھر بھی مہمل الفاظ کی بھرتی اشعار میں زیادہ نہیں ھونے دیتیں - شعر کا موضوع البتہ تنگ اور محدود تھا - نبی نے ذیل کے اشعار میں اسی کی شکایت کی ھے :—

باقسه اءے اکثر سخن شاعرخام   سنبل و زلف و مے و بلبل و جام
چیقا مان دا ئرہ دلبردن   خط و خال و لب و چشم تردن
(الخ)

(اگر غور کرو تو اکثر شعراء کے سخن کو خام پاو گے —
اس میں صرف سنبل و زلف و مےء و بلبل و جام ہوتا ہے -
ان کے نقوش دلبر کے دائرہ سے باھر نہیں آنے پاتے -
بس اس کے خط و خال ھیں ' یا لب یا نشیلی نگاھیں - ایک سبزہ زار پر کلیلیں کرتا ہے - دوسرا بہار کے مزے لوٹتا ہے - کوی نئے راستوں میں قدم نہیں رکھتا —
بلکه پرانے جانے پہچانے رستوں پر پڑے ہوے چلے جارہے ھیں) -
مذکورہ بالا چند اشعار پڑہ کر ھم قدیم ترکی ادبیات کی اچھی خاصی تصویر اپنے ذھنوں میں قائم کرسکتے ھیں - یہ قدیم مذھب ادبیات کلاسک ' لکیر کا فقیر ' اور لفاظی سے بھرا ھوا ہے ' لیکن یہ بات چنداں تعجب خیز نہیں ہے ' اس لئے که اس زمانے کی معاشرت اور زندگی بھی ایسي ھی تھی ' انسانوں کی اُمنگیں پست اور اغراض محدود تھے ' چنانچہ ادبیات کے بھی جو تھوڑے بہت اصناف تھے ' وہ بھی انھیں کی ھمنوائی کرتے تھے - پرانا مذھب ادبیات تمثیلی تھا - حقیقت نگاري اس میں نه تھی ' اس میں نری تخیل آفرینی تھی اور وہ بھی چند بندھي ٹکی اصناف میں - جزئیات اپنی اپنی جگه پر بہت پرشکوہ ھوتی تھیں ' لیکن مجموعی حیثیت سے ساخت ناقص ھوتی تھی - اس زمانه کی ادبیات میں تم کو جذبات کا تلاطم نظر نه آئے گا ' بلکه ھلکے اور دھیمے تاثرات' اور ایسے پیش پا افتادہ استعارات ملیں گے' جن کا حقیقی زندگی سے کوئی لگاؤ ھی نہیں - مختصر

یہ ہے کہ یہ ادبیات ایک مصنوعی اور خود ساختہ طبقہ کے مذاق کی آئینہ دار تھی، اور اس لئے خود بھی مصنوعی تھی - شعراء جمہور کے درمیان رہتے سہتے تھے، لیکن جمہور کو شعراء کے دیوانوں میں کوئی جگہ نہ ملتی تھی - ان کے پر شکوہ قصیدوں اور عاشقانہ غزلوں میں تمہیں عام انسانوں، کھیتوں میں کام کرنے والوں، کسی دور دراز میدان جنگ میں خون میں نہاکر مرنے والوں کے جذبات، ان کی امنگیں، ان کے صدمات، ان کی خوشیاں، ان کے غم و الم، ان کے حوصلے —— ان میں سے کسی ایک کی بھی صدائے بازگشت سنائی نہ دے گی - اس ادبیات میں کسی قسم کی انفرادیت یا شخصیت تمہیں نظر نہ آے گی، اس لئے کہ اس نے اپنے سانچے روز مرہ کی معمولی زندگی سے نہیں لئے تھے، بلکہ ایک سانچہ پسند کرلیا تھا، اور اسی کو ہر موقع پر استعمال کیا جاتا تھا - تمام قدیم ترکی شاعروں کے معشوق ہو بہو ایک سے ہیں، اور تمام شعرا کی مثنویوں میں جو جذبات رنج و الم بیان کئے گئے ہیں وہ سب کے سب ایک ہی فرضی اور خیالی شکستہ دل سے نکلے ہیں —

انقلاب فرانس نے حریت کے انفرادی جذبات پیدا کرکے مشرق قریب کو بھی خواب سے بیدار کردیا - نپولین جب مصر میں پہنچا، تو نئی نئی حربی چالوں کے ساتھہ نیا عربی چھاپہ خانہ بھی اس کے ساتھہ وہاں داخل ہوا - انقلابی خیالات اور یورپی باشندوں کی بیداری نے ترکوں کے تخیلات اور احساسات میں بھی حرکت پیدا کی فرانسیسیوں سے تو وہ پہلے ہی سے واقف تھے، اور جب انہوں نے دیکھا کہ فرانسیسی فوجوں نے یورپ کے صدیوں کے جمے ہوے تخت الٹ کر رکھدئے ہیں، تو مشرق کی کہنہ اور خواب آلود فضا میں بھی انفرادیت، تشکیک اور نئی تحقیق و تلاش کا شوق

تیزی کے ساتھ سرایت کر گیا - سر زمین فرانس ترکوں کی نظروں میں ایک نیا جہان اور نیا عالم بن گئی، اور جس طرح وہ صدیوں سے مشرقی خیالات پر ثابت قدم تھے، اسی طرح اب صرف فرانس کے مطیع و معتقد اور ثناخواں بن گئے - فرانسیسی تخیلات، فرانسیسی افکار کے نمونے، فرانسیسی مذاق ادبی، فرانسیسی معاشرت - ان کی کشش نے ترکی کے بہترین دل و دماغ کو اپنی طرف مائل کرلیا، اور انھوں نے اس کی کوشش کی جس طرح ہوسکے، فرانس کے خیالات کو مشرق کی فضا کے موافق اور مطابق بنالیا جائے - سلطان محمود کو جن مشکلات و حوادث کا سامنا کرنا پڑا تھا، ان کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ یورپی طور طریقے اختیار کرلئے جائیں، چنانچہ سلطان عبدالمجید خان نے فرمان گل خانہ صادر کرکے ایک نئے دور کی داغ بیل ڈالی - اس فرمان میں مساوات کو قانون، نظم و نسق مملکت، اور عدل، سب سے پہلے جگہ دی گئی تھی - اگرچہ یہ کار روائی اتنی ہی اندیشہ ناک اور پر خطر تھی جتنا کہ جانثاریوں کا قلع قمع، لیکن بتدریج اس کے بعد دوسری کار روائیاں بھی کی گئیں، جن سے پرانی بنیادیں اکھڑ گئیں، اور نئی تعمیر کے لئے جگہ پیدا ہوگئی - اسی فرمان گل خانہ کی بدولت ' شناسی، کو اپنا اخبار" تصویر افکار" نکالنے کا موقع ملا ' اور نامق کمال اپنا ڈراما " وطن " لکھ سکا - لیکن بدقسمتی سے ترکی جمہور اور حکمران طبقہ دونوں دنیا کے حالات سے ہنوز با خبر نہ تھے ' اور بہت جلد سازشوں کا بازار ایسا گرم ہوگیا کہ اصلاح کی ساری تجویزیں بے نتیجہ ہو کر رہ گئیں - "رشید پاشا " نے ' جسے یورپی اصلاح کا بانی مبانی کہا جا سکتا ہے ' عوام کی تعلیم کا کام شروع کیا، لیکن اس کے صلہ میں اسے قتل کی دھمکی دی گئی ' وجہ یہ تھی کہ جو لوگ پرانی وضع پر اڑے ہوئے تھے ' انہیں رشید پاشا کے مدارس کی جدید تعلیم کی

طرف سے خوف اور بدظنی تھی - اسی نے اخبارات جاری کروائے ' جن کا سب سے بڑا اثر یہ ہوا کہ ترکی زبان جو پہلے بعید از فہم تھی ' عام فہم بن گئی - اسی نے اعلیٰ تعلیم کی اشاعت کے لئے ' انجمن دانش ' قائم کی - لیکن ان اصلاحات کا رد عمل نہایت عجیب و غریب ہوا - اس پر ہر طرف سے لعن طعن ہونے لگی کہ بچوں سے جغرافیہ کے نقشے کھنچوا کر وہ انھیں تصویر کشی سکھاتا ہے ' اور اس کے رسوخ کے مٹتے ہی یہ تمام نقشے تلف کر دئیے گئے - اسی طرح سے جب اس نے یہ تجویز پیش کی کہ نوجوان ترک سپاہی اعلیٰ فنون حربی کی تعلیم کے لئے یورپ روانہ کئے جائیں ' تو جو بد ترین بد معاش اور بد اخلاق آدمی مل سکتے تھے ' ان کا انتخاب کیا گیا ' اس میں مصلحت یہ تھی کہ ترکی کے ہونہار فرزند یورپ کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھنے نہ پائیں گے ' اور باقی رہے خود یہ لوگ ' تو یہ پہلے ہی سے اتنے خراب ہیں کہ یورپ جا کر ان کے اور زیادہ بگڑنے کا اندیشہ نہیں !

اس طرز عمل سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ترکی میں آپس کی شکر رنجیوں کو دور کرنا اور جہالت کی تاریکی کو مٹانا کتنا مشکل کام تھا - اراکین نظم و نسق مملکت بھی ان جدتوں اور بدعتوں سے خائف تھے ' اور اسے اپنی ہوس پرستیوں کے حق میں پیام مرگ تصور کرتے تھے —

اس زمانہ میں ادبیات کے لوا بردار ' ' عاقف پاشا ' اور ' پرتو پاشا ' تھے - عاقف یورپی زبانوں سے واقف نہ تھے ' اور انھوں نے بالقصد و ارادہ ادبیات میں کوئی جدت نہیں پیدا کی - دفتری مراسلات میں تو ان کا طرز تحریر اپنے پیش رووں کے مقابلہ میں کسی حیثیت سے بھی ترقی یافتہ نہیں کہا جا سکتا ' البتہ ان کے خانگی خطوط اور ان کے بعض بعض اشعار میں ایک خیال ایسا نظر آ جاتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نئی روشنی کی کرن

پڑنے والی ھے : —

" وہ اپنی تحریروں میں اپنے دل کی ترجمانی اوراپنی "

" اصلی روح کا نقشہ اتارنا چاھتے ہیں "

' پرتو پاشا ' نے ' روسو ' (Rousseau) اور ' وکٹر هیو گو ' (Victor Hugo) کی کتابوں کے ترجمے شروع کئے ' اسی طرح ' اپنی نظموں میں انھوں نے یورپی طرز کی مخلوط بحریں استعمال کیں اور ترکی کے عامیانہ گیتوں کے بول (پنگل) کننا شروع کئے - لیکن ان جدتوں میں سے کوئی بھی بہت زیادہ کامیاب نہیں هوی - وہ زمانہ ان اصلاحات کے لئے ساز گار نہ تھا ' ابھی تک ایسی کوئی هستی پیدا نہیں هوئی تھی ' جو جمہور کو بیدار کرے اور ان میں قومی احساس پیدا کرے - ایک صدی قبل ترکی میں جو کچھہ اصلاحات هوئیں ' وہ خود سلاطین نے اپنے تخت و تاج کو محفوظ رکھنے کی غرض سے کی تھیں ' مثلاً سرکاری ملازمتوں اور عہدوں میں کچھہ رد و بدل ' اور یہ پہلے بھی کئی مرتبہ کیا جا چکا تھا - لیکن وہ نئی روح جو رفتہ رفتہ رعایا کے اندر سرایت کر گئی سلاطین اور پاشاؤں کی پیدا کی هوئی نہیں تھی ' بلکہ خود جمہور میں سے ایک شخص کی تھی ' جسے ترکی قومی ادبیات کا سب سے پہلا نمائندہ کہا جا سکتا ھے ' یعنی ' شناسی آفندی ' - ادبیات کے متعلق شروع سے ایک خاص مقصد ' شناسی ' کے پیش نظر تھا - اس کی تحریریں محض تفنن طبع کے لئے نہ هوتی تھیں - وہ قدیم سے جدید کی طرف زینہ بہ زینہ اور درجہ بہ درجہ ترقی پسند نہیں کرتا تھا بلکہ خیال کی ایک دوسری هی فضا پیدا کرنا اس کا مقصد تھا ' وہ انقلاب پسند تھا ' اور وهی ترکی کا سب سے پہلا معاشرتی اور تمدنی انقلابی تھا - پانچ سو برس پہلے کے قدیم ایشیائی مذهب خیالات کی جگہ وہ ایک نیا مذهب

خیالات پیدا کرنا چاھتا تھا ' اور اسے اور اس کے احباب کو جس آسانی سے اس کام میں کامیابی ھوئی ' اس سے معلوم ھوتا ھے کہ قدیم مسلک کتنا فرسودہ اور بے جان ھوکر رہ گیا تھا —

شناسی سنہ ۱۸۲۶ ء میں پیدا ھوا - اس زمانہ میں یہ دستور تھا کہ جو لوگ سرکاری ملازمتیں چاھتے تھے وہ دفتر کلم (Kalem) کے مدرسہ میں بھیج دئے جاتے اور جو لوگ کسی علمی خدمت پر جانا چاھتے وہ " مدرسہ " میں شریک ھوتے - لیکن رعایا کی بہت بڑی تعداد ناخواندہ اور جاھل رھتی - شناسی نے سرکاری ملازمت کو پسند کیا ' اور اپنے فرائض کے ساتھ ساتھ فرانسیسی زبان بھی سیکھی - عنفوان شباب ھی میں وہ پیرس بھیج دیا گیا ' اور یہیں سے اس نے وہ یادگار خط اپنی والدہ کے نام لکھا جس کے آخری الفاظ یہ ھیں :—

" میں ھمیشہ شریفانہ کاموں میں مشغول رھوں گا "

" اور مذھب اور ملک' وطن اور ملت پر اپنی جان فدا کردوں گا "

شناسی ھی وہ پہلا ترک ھے ' جس نے سب سے پہلے ' اور وہ بھی صرف سترہ سال کی عمر میں " وطن " اور " ملت " کے الفاظ کو ان معنوں میں استعمال کیا - چونکہ اسے ادبیات سے خاص شغف تھا ' اس لئے اسے فرانسیسی مصنفین کی صحبت مل گئی ' اور لامارتی نے (Lamartine) ار نست رینان (Ernest Renan) اور ساسی (Sacy) کے علمی حلقہ تک اس کی رسائی ھو گئی - چند سال کی تعلیم کے بعد وہ ترکی واپس آیا ' اور یہاں پہنچ کر مصلح اعظم رشیدپاشا نے اسے " انجمن دانش " کا رکن بنادیا ' لیکن جیسے ھی رشیدپاشا کا رسوخ مٹا ' شناسی کو محض اس وجہ سے کہ وہ " ڈاڑھی منڈا " تھا وھاں سے نکال باھر کیا گیا ! اس واقعہ کے تھوڑے ھی عرصہ بعد وہ پھر

پھرس واپس چلا گیا ' اور اگرچہ اسے کئی خدمتیں پیش کی گئیں ' لیکن اس نے ان کے قبول کرنے سے انکار کردیا اور سنہ ۱۸۷۰ ع میں ایک ترکی اخبار نکالا ' جس میں یورپی طرز اختیار کرنے پر زور دیا جاتا تھا - قدامت پرستوں نے اس کی مخالفت شروع کی ' لیکن جوان همت شناسی ' اپنے گنتی کے چند دوستوں کی رفاقت میں ' آخر تک ان کے مقابلہ میں پامردی سے جما رہا - اس کا انتقال قبل از وقت یعنی ۴۶ سال کی عمر میں ہوا ' لیکن جو بیج اس نے بویا تھا ' وہ اس کی زندگی ھی میں ایک چھتنار درخت بن چکا تھا - سیاسی حیثیت سے ' وہ مشروطہ خواہ تھا - ادبیات میں اس کا مسلک یہ تھا کہ متقدمین کی فرسودہ رسمیت کو توڑ دیا جاے ' اس نے اپنے ملک کی بہت بڑی خدمت کی ھے - اس کی دلیری ' پا مردی ' اور اخبار نویسی کی قابلیت نے تجدد میں جتنا حصہ لیا اور اس تحریک کو جتنا آگے بڑھایا ' وہ کسی اور سے نہ هوسکا - لیکن اس کے اغراض و مقاصد اس قدر بلند اور شریفانہ تھے کہ اس کی ادبی قابلیت ان کا ساتھ نہ دے سکی - اسے خود بھی اس کا احساس تھا کہ میرا طرز کسی قدر سطحی اور خشک ھے اور میرے معتقدات کی ترجمانی پوری طرح نہیں کرسکتا :-

اینجہ در کرچہ بو فکرم قابا دوشدی تعبیر

ایلدم صانکہ سوکب ایلہ حوری تصویر

(افسوس میرے خیالات سطحی ھیں اور ان کی زبان ناقص -
گویا میں نے قلم دوات سے حور کی تصویر اتاری ھے) -

لیکن ان کوتاهیوں کے باوجود ' محض شناسی کے خلوص اور صداقت کی وجہ سے ' ایک ایسی تحریک شروع هوگئی ' جو اس کے تہذیبی اور سیاسی رجحانات کے عین مطابق تھی ' یعنی ترکی زبان کی پاکی اور صفائی -

اسلام کی ہمہ گیری ، اور عجمی اور عربی تہذیب کی مقبولیت کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ ترکی زبان ایک کار آمد مخلوط زبان بن کر رہ گئی تھی ، جو ، اگر سنجیدگی اور اعتدال کے ساتھ استعمال کی جاتی ، تو یقیناً شان و شوکت کے اعتبار سے ، دنیا کی تمام زبانوں کی ، خواہ زندہ ہوں یا مردہ ، ہمسری کرسکتی تھی ، لیکن اگر بے احتیاطی سے استعمال کی جاتی — اور بدقسمتی سے اکثر یہی ہوتا تھا — تو اس کی حیثیت محض ایک بے معنی طومار لفظی کی سی ہوجاتی تھی - شناسی نے اپنے اخبار میں جس ٹھیٹ طرز تحریر کی ابتدا کی تھی ، اس کے متبعین اس کو نہ پہنچ سکے - شایستہ اور شستہ زبان لکھنے کے لئے عربی اور فارسی الفاظ کے بغیر کام نہ چل سکتا تھا ، اور شناسی کی تحریر سے بلند پایہ تحریروں میں ان کا استعمال ناگزیر تھا - اس کے شاگرد اور متبعین مثلاً نامق کمال ، اکرم اور عبدالحق حامد جن میں صحافت نگاری کی بجائے ، شاعری کا رجحان غالب تھا ، زبان کے بارے میں اتنا ٹھیٹ مذاق نہ رکھتے تھے ، جتنا شناسی —

شناسی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے ایک ترکی اخبار " ترجمان احوال " نکالا - چونکہ ٹھیٹ ترکی کے استعمال کا اسے خاص طور پر شوق تھا ، اس لئے اس نے ایک صرف و نحو کی کتاب اور ایک ترکی لغت بھی مرتب کی - چونکہ طبیعت ایجاد پسند تھی ، اس لئے اس نے ایک طنزیہ ناٹک " شاعر کی شادی " بھی تصنیف کیا ، جس میں ترکی کی شادی کی رسموں کا خاکہ اڑایا گیا تھا —

ترکوں میں جو سیاسی بے چینی اور ہیجان پیدا ہوگیا تھا ، اس کا رنگ ان کی ادبیات پر بھی بہت گہرا چڑھا ہے - ان کی تصنیفات میں وطنی اور ادبی دونوں رنگوں کی ایک عجیب و غریب ملی ہوی جھلک نظر آتی

ھے - وہ ترکی ادب، جو متقدمین کے زمانہ میں روز مرہ کی جیتی جاگتی چیزوں سے بالکل بے تعلق اور بے نیاز رھتا تھا، وھی اب جمہور کے جذبات کا ترجمان بن گیا - ضیا پاشا، جو اسی زمانے کا شاعر ھے، اور جس کے اشعار سب سے زیادہ نقل کئے جاتے ھیں، نوجوان ترکوں کی اس خفیہ جماعت کا رکن تھا، جو طرز حکومت کا انقلاب چاھتی تھی، اور جس نے آخر میں چل کر عبدالعزیز کو معزول کردیا تھا - پہلے وہ کئی سرکاری ملازمتوں پر، مثلاً والی صوبہ، منشیالسلطان وغیرہ رہ چکا تھا - اس کے بعد وہ بھاگ کر یورپ چلا گیا، اور جب واپس آیا، تو مورد عتاب سلطانی بنا اور کسی صوبہ کے شہر میں نہایت کس مپرسی کی حالت میں اس کا انتقال ھوا - اس پر اس قدر مظالم کئے گئے تھے کہ جب وہ مرا ھے تو کسی شاعر کی اتنی ھمت نہ ھوتی تھی کہ تاریخ وفات لکھہ کر اس کی قبر پر کندہ کراتا - اس کے ادبی مشاغل بکثرت تھے - اس نے فرانسیسی زبان سے کتابیں ترجمہ کیں اور دوسروں کے ترجموں کی عبارت کو مثلاً " تاریخ اندلس " پر شکوہ بنایا، لیکن اس کا اصلی کمال اس کے مقالات سے ظاھر ھوتا ھے، جو اس کی دور اندیشی اور فراست کے ثبوت ھیں - ان مقالات میں اس نے بہت جرأت کے ساتھہ یہ ثابت کیا ھے کہ فارسی عروض ترکی زبان کے لئے موزوں نہیں ھے، بلکہ اس کے لئے عروض کی بجائے بول (پنگل) گننا زیادہ مناسب ھے - ترکوں کی حقیقی روح نے اپنے آپ کو جن مصنوعی اور خود ساختہ زنجیروں میں مقید کرلیا تھا، ان کے خلاف وہ علم بغاوت بلند کرتا ھے، لیکن اس کے باوجود اس کا "ترکیب بند"، جو روحی بغدادی کے تصوفانہ ترکیب بند کے جواب میں لکھا گیا، اور وہ ھجو جو اس نے اپنے سیاسی دشمن علی پاشا پر لکھی یہ دونوں فارسی بحروں ھی میں ھیں، اور کہیں کہیں تو اتنی ھی بعید از فہم ھیں، جتنی اس کے پیش روؤں

کی نظمیں - اس کے اشعار آج تک ترکوں کی زبان پر ہیں، اور ان میں سے اکثر تو ضرب المثل بن گئے ہیں —

جس طرح افق مشرق پر ایک کرہ آتشین نمودار ہوتا اور اپنی جگمگاہٹ سے دنیا میں اجالا کردیتا ہے، اسی طرح اب ایک نیا شاعر اور مصنف عرصہ شہود پر جلوہ افگن ہوا، یعنی نامق کمال - اصل میں ترکی ادبیات کا دور جدید اسی سے شروع ہوتا ہے - اگرچہ وہ شناسی کا شاگرد تھا، لیکن ادبی اصلاح کے خیالات کو اس نے انتہائی حد تک پہنچادیا - اس کی ادبی زندگی کا تعلق، بہ نسبت کسی دوسرے شعبہ کے، سیاسیات سے بہت زیادہ تھا - اس کی بے چین اور سیمابی طبیعت نے جمہور کے دل اور تخیل کو مسخر کرلیا، اور اس نے اپنی فصاحت اور شیوہ بیانی سے عظمت رفتہ کو ایک اس سے بھی زیادہ با عظمت و پر شوکت مستقبل کا پیش خیمہ بنا کر پیش کیا - کمال ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوا تھا، جس کے اکثر افراد ترکی کی تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں - عنفوان شباب میں اس نے ایک سرے سے لے کردوسرے سرےتک ترکی سلطنت کی سیاحت کی تھی، غربت اور فلاکت ، نا انصافیوں اور بے عنوانیوں کے جو مناظر اس کے سامنے آے تھے ، انھوں نے اس کے دل پر بہت گہرا اثر کیا تھا اور ملت کے لئے لڑنے کے عزم کو راسخ کر دیا تھا - وہ کم سنی ہی سے شعر کہنے لگا تھا ، اور قدیم مرصع طرز کی غزلیں ، قصائد وغیرہ لکھتا تھا ، لیکن ان ابتدائی زمانہ کے اشعار میں بھی کہیں کہیں وطن پرستی کے رنگ کی جھلک نظر آ جاتی ہے - اس نے فرانسیسی کا مطالعہ شروع کیا اور اپنے دیوان کے آخری صفحہ پر بہت ہاتھ روک روک کر اور سنبھل سنبھل کر ، اس نے بعض فرانسیسی مصنفین کے نام لکھے - یورپ نے اس کی آنکھیں کھول دیں اور

غزلیں لکھنا چھوڑ دیا ' وہ نوجوان ترکوں کی جماعت میں شریک ھو گیا - سلطان عبدالعزیز کی حکومت نے اسے گورنر کا سکریٹری مقرر کر دیا ' لیکن وہ یورپ بھاگ گیا - لندن پہنچ کر ' اس نے ضیا پاشاء کی شرکت میں اخبار " حریت " نکالا ' اور چار برس تک وھاں رھا - جب ترکی میں عام معافی کا اعلان ھو گیا ' تو وہ واپس آیا ' اور قیام یورپ کی بدولت جو اضافہ معلومات اسے ھوا تھا ' اس سے کام لے کر پہلے سے بھی زیادہ جوش کے ساتھہ وطنی خدمت میں مشغول ھو گیا - لیکن اس عرصہ میں ترکی کا سیاسی مطلع مکدر ھو چکا تھا ' اور ترقی خواہ نوجوان ترکوں نے ' جو مشروطہ کے لئے جدو جہد کر رھے تھے ' بہت جلد تاڑ لیا کہ سیاسی مطلع کی یہ گھنگور گھٹا اب برسنے ھی والی ھے - جذبہ آزادی نے جو ایک شریفانہ اور ھمدردانہ جذبہ ھونے کی حیثیت سے ھر شخص کو مرغوب ھوتا ھے ' ترکی میں بسنے والی تمام قومیتوں ' مثلاً رومانوی ' سربی ' بلغاری وغیرہ ' غرض سب کے دلوں میں ایک سی امنگیں پیدا کر دی تھیں - سلطنت ترکی کی بد نظمی کا اثر ان سب پر یکساں پڑا تھا ' لیکن جو رعایا مختلف المذھب اور مختلف النسل تھی ' اس نے (مسلمان ترکوں کے مقابلہ میں) مظالم کو کہیں زیادہ محسوس کیا - علاوہ بریں ان غیر ملکی عناصر کو یورپ کی مسیحی دول پر بھی بھروسہ تھا ' جن کی حکمت عملی ' اگرچہ وہ نہایت کوتہ اندیشانہ تھی ' یہی تھی کہ ترکی کے حصے بخرے کر دئے جائیں - سنہ ۱۸۷۶ ع میں سربیوں نے اعلان جنگ کر دیا ' اور بلغاریوں نے بھی علم بغاوت بلند کر دیا - الگزینڈر بات چیف (Alexander Bothcheff) نے ' جو ایک بلغاری وطن پرست اور شاعر تھا بمقام سلسترا (Sillistra) شاہ دانہ کی لکڑی سے بنی ھوئی بندوق سے پہلی گولی ترکی فوجوں پر چلائی -

اصل میں بلغاریہ اور ترکی دونوں جگھوں کے شاعروں کے دلوں میں ایک ھی سا احساس تھا ' یعنی آزادی اور قومی احساس کی بے روک ٹوک ترقی ' لیکن سیاسی مدبرین اب تک اسی خواب خرگوش میں تھے کہ گرفتاریوں کے خوف اور آھستہ آھستہ اور جرعہ جرعہ اصلاحات دینے سے قومیت کی یہ رو تھم جاے گی —

کمال نے ایک ناٹک ' سلسترا یا خود وطن ' (سلسترا ' یعنی وطن) کے عنوان سے لکھا ' اور جب یہ قسطنطنیہ میں دکھایا گیا ؛ تو غیر معمولی طور پر مقبول ھوا - حاضرین پر اس کے طرز بیان اور سوز و گداز کا اس قدر اثر ھوا کہ وہ بے اختیار ھو کر ' زندہ باد وطن ' " زندہ باد ملت " کے نعرے لگانے لگے - کمال کو دوسرے دن ھی گرفتار کرکے ' قبرس ' (Cyprus) پہنچا دیا گیا ' اور اس بطل جمہور ' اور پہلے ترکی ڈراما کے مصنف کی یہ قدر کی گئی کہ اسے ایک تیرہ و تار اور مرطوب کوٹھری میں ڈال دیا گیا ' جہاں سے اس کی رھائی اس وقت ھوئی جب عبدالعزیز معزول کیا گیا - جدید سلطان ' یعنی سلطان مراد اور اس کے بعد سلطان عبدالحمید یہ دونوں ترقی خواہ جماعت پر نظر عنایت رکھتے تھے ' لیکن بہت جلد جنگ روس کی بد بلا ترکی پر مسلط ھونے والی تھی ' عبدالحمید نے جو پارلیمنٹ بنائی وہ ترکوں کی آرزوؤں اور خواھشوں کے عین مطابق تھی - اب مستقبل کا راستہ صاف تھا اور ملک میں آزادی کا دور دورہ ھونے والا تھا ' لیکن جوشیلے شعراء اور مصنفین نے حقیقت کو نہیں دیکھا ' وہ دوسری ھی سلطنت کے خواب دیکھہ رھے تھے - ترقی خواہ ترکوں کا بہادر قائد ' یعنی نامق کمال خود آج کل کے معنوں میں قوم خواہ نہ تھا ' بلکہ ایک عثمانی وطن پرست تھا - وطن کے متعلق اس کا تصور یہ تھا کہ مسلمان ترکوں کی سلطنت قائم ھو '

پچھلے زمانہ میں جس طرح راہ اسلام میں جانبازی کی بدولت اسلام کو عروج نصیب ہوا تھا ' وہ انہیں مستقبل کے متعلق بھی ہمت دلا تا تھا - بالفاظ دیگر ترکی قوم پرستی کا منشاء و مدعا یہ تھا کہ انیسویں صدی کے یورپ کے اسلحہ اور طریقوں سے کام لے کر اسلام کا احیاء کیا جاے - نامق کمال کا طرز تحریر تھیٹ نہیں بلکہ کسی قدر مغلق تھا اس کی نثر کی کتابیں مثلاً جزمی ' ناولیں اور قصے مثلاً بارکۂ ظفر' قانچی' اس کے ڈرامے مثلاً " وطن " زاولی چوجق (غریب بچہ) ان سب میں کسی قدر لفاظی نظر آتی ھے - سخن آرائی اب تک معنی آفرینی پر غالب ھے ' اس کے قصوں کے افراد اسی کی سی رنگین اور مرصع زبان بولتے ھیں اور ان کی سیرتوں میں جو رقت پسندی نظر آتی ھے وہ بھی کچھہ ایسی زیادہ مرغوب اور پسندیدہ نہیں - لیکن چاھے ھم یہ نہ مانیں کہ کمال فن کا بادشاہ تھا ' تاھم یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ میدان عمل کا دھنی تھا ' اور اس کی ذات ھر ترکی محب وطن اور پر جوش انقلابی کے لئے نمونہ بن سکتی ھے ۔ اس کی ادبی کوتاھیوں کے باوجود ' ترکوں کے دلوں میں کمال کی جگہ بحیثیت ایک بلند پایہ اور بہترین مصنف کے ھمیشہ باقی رھے گی ' اس لئے کہ جس روح نے ترکی کو گرما دیا ' وہ کمال ھی کی پیدا کی ھوئی تھی —

کمال کے شاگردوں اور ثناخوانوں کا حلقہ بہت وسیع تھا - انھی میں سے ' اس کا مخلص دوست اور شاگرد رجائی زادہ اکرم بھی تھا ' جو ادبیات کا پروفیسر اور باب حکومت کا رکن تھا - اگرچہ وہ ھمیشہ سلطنت کا وفادار رھا ' لیکن پولیس کی بدظنی سے وہ بھی نہ محفوظ رہ سکا ' اور اسے اپنے تمام ادبی لکچروں کو محکمہ سیاسیات کو دکھانا پڑتا تھا - اکرم ایک پرگو شاعر بھی تھا ' اس کی شاعری کا رنگ عاشقانہ تھا اور چونکہ

اس میں سوز و گداز کوٹ کوٹ کر بھرا تھا ' اس لئیے اس کے اشعار زیادہ تر زندگی کے تاریک پہلووں کے متعلق ہوتے تھے - اس کے ہم عصر اسے موجد اور اعلیٰ درجہ کا ذہین شخص سمجھتے ہیں ' اور اس حیثیت سے وہ بے شک موجد کہے جانے کا مستحق ہے کہ فرانسیسی ادبیات کے اثر سے ' اس نے متقدمین کے راستہ سے ہٹ کر شاعری کے لئیے نئیے نئیے موضوعوں کا انتخاب کیا اور قدیم لفاظی اور صنعت بازی کی زنجیروں کو توڑنے کی کوشش کی ' لیکن اس میں وہ اکثر نا کام بھی رہا - باقی رہی اس کی ذہانت اور ذکاوت ' تو اس کے ماننے میں ایک خارجی نقاد کو کسی قدر کلام ہوگا ' اس لئیے کہ دوسرے شعر گویوں کے مقابلہ میں اس میں کوئی خاص ابداع یا اختراع ' تخلیقی قوت ' یا خیالات کی کوئی غیر معمولی خوبصورتی نظر نہیں آتی - اس کی زبان بھی ہمیشہ بے عیب اور اعتراض سے خالی نہیں ہے اور اس کے حریف معلم ناجی نے اس پر جو سخت تنقیدیں کی ہیں ' وہ اکثر و بیشتر حق بجانب ہیں —

نوجوان ترکوں میں جو جذبہ وطن پرستی پیدا ہو گیا تھا ' اس کا ایک اور باکمال ترجمانؔ عبدالحق حامد ہے ' وہ نامق کمال کا دوست اور شاگرد تھا ' لیکن بہت جلد اپنے استاد پر چھا گیا ' اور مشرق کے مشہور ترین مصنفین میں اس کا شمار ہونے لگا - وہ سنہ ۱۸۵۱ ع میں ایک شریف اور علمی مذاق رکھنے والے خاندان میں پیدا ہوا ' اور اسے دنیا دیکھنے اور مشرق اور مغرب دونوں کی زبانوں اور ادبیات کی گہری واقفیت حاصل کرنے کا موقع ملا - اس نے بمبئی ' میڈرڈ ' لندن غرض کہ یورپ اور ایشیا کے مختلف شہروں میں ترکی سفارت خانوں میں ملازمت کی ' علوم مشرقیہ کے متعلق تو اس کی نظر پہلے ہی سے بہت گہری تھی ' اب اس کے ساتھ

ساتھہ، اس نے فرانس کے رومانی (Romantic) اور انگلستان کے شیکسپیری مذاهب ادبیات کا اثر بھی قبول کیا - وھی سب سے پہلا ترکی مصنف ھے، جس نے بحیثیت شاعر، نثار اور تمثیل نگار کے، نو مشقوں کی سطح سے بلند ھوکر، ترکی زبان کو ادبی خیالات کے اظہار کا ایک اعلی درجہ کا وسیلہ بنادیا ۔ عبدالحق حامد کی زبان میں بڑی خوبی یہ ھے کہ اس میں آورد اور تصنع کا کہیں نام نہیں، اور لغت بازی اور تلاش لفظی کا اس میں شائبہ بھی نہیں پایا جاتا - اس کے الفاظ میں اس کے خیالات کی سی روانی پائی جاتی ھے اور ایسا کبھی نہیں ھوتا کہ محض زبان لکھنے کے شوق میں لفظ لکھے گئے ھوں —

عبدالحق حامد کا ادبی رنگ یہ ھے کہ وہ اپنے موضوعوں کے انتخاب میں رومانیت اور ان کے بیان کرنے میں حقیقت نگاری سے کام لیتا ھے، اس نے اپنے موضوعوں کو یا تو تاریخ مشرق سے لیا ھے تاکہ وہ انسانی قوتیں جو تاریخ کی تہ کے نیچے کام کرتی ھیں جیتی جاگتی بن کر قارئین کی نظروں کے سامنے آجائیں، یا پھر حقیقی زندگی کے واقعات کو موضوع بنا یا ھے، تاکہ خاص خاص قسم کی عورتوں اور مردوں کی زندگیاں، اور ان کے جذبات اور آلام کے نقشے پڑھنے والوں کی آنکھوں کے آگے آجائیں - بحیثیت تمثیل نگار (ڈراماٹسٹ) کے وہ اپنے ھم ملکوں میں پیش پیش ھے، اور اگرچہ اس کے ڈرامے ھمیشہ کتابی شکل ھی میں رھیں گے، کیونکہ اپنی پیچیدہ فنی حیثیت کی وجہ سے وہ اسٹیج پر دکھائے جانے کے لئے موزوں نہیں ھیں، لیکن ان میں جو گہرے انسانی جذبات اور بلند پایہ اسلوب تحریر پایا جاتا ھے، اس کی وجہ سے وہ ھمیشہ ترکی ادبیات میں زندۂ جاوید رھیں گے - اس کی ذھانت کا اس سے بڑہ کر اور کیا ثبوت ھو سکتا ھے کہ باوجود اس کے کہ پہلے سے ترکی اسٹیج پر کوئی

نمونہ اس کے سامنے نہ تھا ، تاہم محض غیر ملکی اثرات کے ماتحت اس نے ایسے ایسے ڈرامے لکھے ، اور اپنے قصوں کے افراد کے ایسے ایسے نفسیاتی چربے اتارے جو بہترین یورپی نمونوں سے ٹکر کھاتے ہیں - اس کی تصنیفات تیس کے قریب ہیں - اس کے بعض ڈرامے نثر اور نظم دونوں میں ہیں ، بعض محض نثر میں ہیں ، اور بعض شروع سے آخر تک منظوم - لیکن ان منظوم ڈراموں میں اس نے فارسی عروض استعمال نہیں کی ہے بلکہ قدیم ترکی طریقہ یعنی پنگل (بول) گننے کا استعمال کیا ہے ، اور اسی کے تقاضہ سے اس کی زبان زیادہ ٹھیٹ اور اس کا طرز تحریر سلیس تر ہو گیا ہے —

عبدالحق حامد کے بعض ڈراموں کے قصے ہندوستان سے لئے گئے ہیں - عنفوان شباب ہی میں ، جب وہ ہندوستان آیا بھی نہ تھا ، اس نے ایک ڈراما " دختر ہندو " لکھا تھا ، جس میں ایک انگریز افسر اور ایک ہندوستانی لڑکی کے عشق کا قصہ بیان کیا گیا ہے - انگریز افسر ہندوستان میں جس بے فکری اور عیش کی زندگی گزارتے ہیں ، یہ قصہ اس کی ہو بہو نفسیاتی تصویر ہے - ہندوستانیوں اور انگریزوں کی معاشرت میں جو اختلافات پائے جاتے ہیں اس کے متعلق بھی ہمیں اس قصہ کو پڑھ کر بصیرت حاصل ہوتی ہے ، اور آج سے پچاس سال پیشتر ہی ، ہمیں (اس ڈرامے میں) جمہور ہندوستان کو آزاد کرنے کے متعلق ایک موثر اپیل نظر آتی ہے —

بمبئی کے قنصل خانہ کے قیام کی وجہ سے اسے ہندوستان کی معلومات حاصل کرنے کا موقع ملا - وہ اسے " سبز و شاداب ملک " کہتا ہے " جس کے پرندے انسانی زبان میں باتیں کرتے ہیں " - اس گہری واقفیت ہی کی بنا پر اس نے سنہ ۱۸۸۹ ع میں ، جب وہ لندن میں تھا ، اپنا مقبول عام

ڈراما " فن تن " (Fin ten) لکھا - اور سب ڈراموں سے زیادہ اس کے اسی
ڈرامے میں ہمیں جزئی سے جزئی باتوں میں خاص اہتمام نظر آتا ہے ' اور
اس کے فنی نقوش اور نفس قصہ دونوں میں شیکسپیر کا اثر خاص
طور پر نمایاں ہے - اس موقع پر اگر ہم اس ڈرامے کی تلخیص ناظرین
کے سامنے پیش کریں تو شاید کچھہ ایسا بے محل نہ ہوگا :-

مسز کراس (Mrs. Cross) ' جو " فن تن " کی ہیروئن ہے ' ایک حسین
عورت ہے ' جس کی شادی آسٹریلیا کے ایک متمول شخص سے ہوئی
ہے ' جو سونے کی کانوں کا مالک ہے - یہ عورت لندن میں مقیم ہے '
اور نظر بازیوں اور عشوہ طرازیوں میں اپنا وقت گزار رہی ہے - یہاں
ایک لارڈ اس کے دام عشق کا اسیر ہوجاتا ہے ' مسزکراس کے بطن سے
ایک لڑکا پیدا ہوتا ہے ؛ جسے اپنا لڑکا سمجھہ کر یہ لارڈ مسزکراس سے
شادی کرنا چاہتا ہے - لیکن اس میں کئی دقتیں ہیں ' جنھیں دور
کرنے کے لئے حوصلہ مند مسزکراس (فن تن) ایک نہایت جسارت آمیز
ترکیب سوچتی ہے - پہلے اسے ایک مدقوقہ لڑکی کی تلاش ہے ' جس
کی شادی لارڈ سے کردی جاے ' اور اپنے ناجائز اور کاودي لڑکے
کو اس لڑکی کی جائز اولاد بتا دیا جاے - اس کے بعد وہ یہ چاہتی
ہے کہ اپنے وفادار نوکر کے ہاتھوں اپنے شوہر کو مروا ڈالے - اپنے طبیب
خاص کی مدد سے اسے مدقوقہ لڑکی تو ایک اسپتال سے مل جاتی ہے '
لیکن اس کا وفادار نوکر دولاجی راو ' جو ہندوستانی ہے ' راضی نہیں ہوتا ہے ' وہ
اپنی مالکہ کا ہر حکم بجالانے کے لئے تیار ہے ' وہ اس کے لئے تیار ہے کہ جنگل میں
جاکر شیرنی کے پنجے سے اس کے دودھ پیتے بچے اٹھالاے ' لیکن اپنے بوڑھے
مالک ' مسٹر کراس ' کو مارنے کے لئے وہ آمادہ نہیں ہوتا - بہت کچھہ

بحث مباحثہ کے بعد ' جس میں ' فن تن ' ' دولاجی راو ' کی محبت کا دم بھرتی ھے ' اور جس سے برسبیل تذکرہ یہ راز بھی آشکار ھوتا ھے کہ وہ ناجائز لڑکا دراصل اس نوکر کے عشق ھی کا نتیجہ ھے ' بالآخر نوکر نمک حرامی پر راضی ھوتا اور آسٹریلیا کی طرف روانہ ھوجاتا ھے -

لیکن یہاں سے پیچیدگیاں پڑنا شروع ھوتی ھیں - مدقوقہ لڑکی ' (جسے اسٹیج پر لاتے وقت شاعر نے گریز کرکے بیماروں ، ان کے آلام اور ان کی موت کے متعلق لمبے چوڑے اشعار لکھے ھیں) لارڈ سے محبت کرنے لگتی ھے ' اور اپنی مہلک بیماری سے اچھی ھو کر اس کے ساتھ ' بیروت ' بھاگ جاتی ھے ' ' فن تن ' آتش رقابت سے جل کر ان کا پیچھا کرتی ھے - لیکن اب وہ لارڈ دل و جان سے اس لڑکی سے محبت کرنے لگا ھے جو پہلے مدقوقہ تھی ' اور وہ ' فن تن ' کو منہ بھی نہیں لگاتا - اس کے بعد سمندر پر ایک طوفان خیز رات کا منظر پیش کیا گیا ھے ' ' فن تن ' ایک چھوٹی سی کشتی میں سوار ھوکر لارڈ کے تعاقب میں جاتی ھے اور قریب ھے کہ طوفان میں ھلاک ھوجائے ' لیکن دولاجی راؤ جو آسٹریلیا سے اپنے مالک کو قتل کرنے واپس آرھا ھے ' اس کی چیخیں سنتا ھے ' اور اسے بچا کر اپنے جہاز پر لے آتا ھے ' جس پر خود اس کی معشوقہ جو ایک کسان کی لڑکی ھے ' اس کے ساتھ سفر کررھی ھے - یہاں پھر کسان کی لڑکی اور فن تن کے درمیان رقابت کا منظر پیش آتا ھے اور دولاجی راؤ اس لڑکی کو قتل کرڈالتا ھے ' اور فن تن کو گود میں لیکر جہاز سے کود پڑتا ھے اور تیر کر صحیح و سلامت کنارے پر پہنچ جاتا ھے - اب یہ دونوں لندن میں زندگی بسر کرتے ھیں - فن تن لارڈ کو بھول جاتی ھے ' لیکن اپنے لڑکے کو واپس پانے کی غرض سے ' اسے مطلع کرتی ھے کہ اس

کا اصلی باپ دولاجی راؤ ہے - یہ دونوں شادی شدہ زندگی بسر کرتے ہیں ' لیکن دونوں میں سے کسی کو بھی اطمینان نصیب نہیں ہے - دولاجی راؤ قید ہو جاتا ہے ' اس کو وہاں سے چھڑانے کے لئے فن تن کئی روز گھر سے باہر رہتی ہے ' اور بالآخر اسے رہا کرا لاتی ہے ' لیکن دولاجی راؤ فن تن کی طرف سے بدظن ہو جاتا ہے اور غصہ میں آکر اپنے لڑکے کو مار ڈالتا ہے' فن تن محبت مادری سے بے تاب ہو کر دولاجی راؤ کو گولی سے ہلاک کر دیتی ہے —

سیاہ فام دولاجی راؤ کی رقابت ہمیں آتھیلو کی رقابت یاد دلاتی ہے' لیکن ڈرامے میں کچھہ ایسے فنی نقائص پائے جاتے ہیں کہ ہم ان دونوں (آتھیلو اور دولاجی راؤ) کا محض سطحی طور پر ہی مقابلہ اور موازنہ کرسکتے ہیں - معلوم ہوتا ہے کہ اس ڈرامے کو مصنف نے بہت کچھہ محنت اور کاوش سے لکھا ہے ' لیکن اس کے بعض بعض اشعار میں غضب کی روانی پائی جاتی ہے - ایک اور ڈراما ' جس کا قصہ تاریخ ہندوستان سے لیا گیا ہے ' ' اشبر ' ہے - اس کے لکھتے وقت ترکی مصنف کے سامنے کارنیلی کا ' جو رومانی طرز کا جید فرانسیسی استاد تھا ' قصہ ہوریس (Horace) بطور نمونہ کے تھا - اشبر کشمیر کا بادشاہ ہے - فاتح عالم سکندر رومی اس کی حسین بہن پر عاشق ہو جاتا ہے - یہ لڑکی جس کا نام ' سمرو ' ہے اس خیال سے کہ اس کے بھائی اور سکندر میں جدال و قتال کی نوبت نہ آنے پائے ' معاملہ کو رفع دفع کرنے اور سمجھوتا کرانے کی کوشش کرتی ہے ' لیکن مغرور بادشاہ اس پر راضی نہیں ہوتا اور اپنی بہن کے قتل کا حکم دے دیتا ہے - اس اثنا میں سکندر ملک پنجاب کی طرف پیش قدمی کرتا ہے رکزن (Rokzan) دارا کی بیٹی ' جو خود سکندر پر عاشق ہے

اس کی کوشش کرتی ھے کہ وہ اپنی معشوقہ سہرو سے نہ ملنے پاے لیکن سکندر اسے هاتھی کے قدموں کے نیچے روندواکر مار ڈالتا ھے ' اور بہادر اشبر کو شکست دیتا ھے ' جو شرم کے مارے خود تلوار مار کر مر جاتا ھے۔ اس کشت و خون کے دوران میں ارسطو بھی اسٹیج پر آتا ھے اور اس طنزیہ جملہ سے ڈرامے کو ختم کرتا ھے " اسی کا نام فتح ھے ! " —

اگر چہ اس ڈرامے کی فضا مصنوعی ھے ' جسے تاریخی ڈراما لکھنے والے فرانسیسی رومان نویسوں کا ورثہ سمجھنا چاھئے ' تاھم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس میں تمثیلی توازن کوٹ کوٹ کر بھرا ھوا ھے —

عبدالحق حامد کا ایک اور ڈراما بھی ھے ' جو کارنیلی (Corneille) کے " لی سڈ " (Le Cid) کے طرز پر لکھا گیا ھے۔ اس ڈرامے میں مصنف نے پہلی مرتبہ پنگل کی بحروں کو استعمال کیا ھے ' لیکن چونکہ اسے اسٹیج کی زبان کا لحاظ بھی رکھنا پڑا ھے ' اس لئے اس کی موسیقیت جا بجا کسی قدر اکھڑی اکھڑی معلوم ھوتی ھے۔ اس ڈرامے کا نام " نسترن " ھے۔ قصہ کا منظر کابل میں ھے اور اس میں تخت و تاج کے ایک جھوٹے مدعی کی ' اپنے باپ کے خلاف سازشوں کو دکھایا گیا ھے۔ قصہ میں جان ڈالنے کے لئے رومانی عشق و محبت کی چاشنی دی گئی ھے —

ایک اور رومانی ڈراما ' " زینب " ھے ' جس میں مافوق البشری قوتوں کی تاثیرات اور الہامات سے بحث کی گئی ھے۔ اس کا ماحول بھی مشرقی ' یعنی ھندوستانی اور افغانی ھے۔ اس کا کچھ حصہ منظوم ھے ، اور کچھ نثر میں ' نثر کا حصہ نسبتاً زیادہ بر جستہ اور جاندار معلوم ھوتا ھے —

اب ھم اس پرنویس مصنف کے بقیہ ڈراموں کے صرف عنوانات ھی

بتانے پر اکتفا کرتے ھیں - اس کی پرنویسی کا اندازہ اس سے ھو سکتا ھے
کہ جب اس کی غیر معمولی طبیعت حاضر ھوتی اور آمد شروع ھوتی تو
وہ ایک ایک دن میں ڈیڑھ سو شعر کہہ دیا کرتا تھا :—

'' سر ڈنپل '' آشوری زمانے کا ایک تاریخی ناٹک ھے طارق '
ابن موسیٰ ' طزر اور عبداللہ الصغیر ' ان سب کے قصے عربی اندلس
سے لئے گئے ھیں ' لبرٹی ' یہ ایک مثالیہ قصہ ھے ' جس میں عبدالحمید
کی استبدادی حکومت پر چوٹیں کی گئی ھیں : الخان اور ترخان ان میں
مصنف نے تورانی ترکوں کی سابقہ عظمت کے گیت گائے ھیں - ان دونوں
ڈراموں کو گویا اس تحریک '' توران خواھی '' کی منادی سمجھنا چاھئے '
جو بعد میں چل کر ظاھر ھوئی —

عبدالحق حامد صرف ایک پر زور تمثیل نگار ھی نہ تھا ' بلکہ بیانیہ
شاعری پر بھی اسے اعلیٰ درجہ کی قدرت حاصل تھی - اپنی نظم صحرا و بلدہ
میں اس نے اس عشق کا اظہار کیا ھے جو اسے سبزہ زاروں ' مرغزاروں '
دھیمی ھوا میں ھلنے والے درختوں اور ان کی تر نم ریزیوں کے ساتھہ تھا -
ان چیزوں کو وہ خالص الہامات سمجھتا ھے اور ان کے مقابلے میں شہروں
کے تصنعات اور زر پرستیوں کو نام دھرتا ھے - حامد سے پہلے کسی
ترکی شاعر نے نہ تو دیہات کی فضا کا اتنا گہرا اثر اپنے قلب پر لیا
تھا ' اور نہ اس زور اور قدرت کلام کے ساتھہ اسے بیان کیا تھا - اد بیات
کی یہ صنف خالص مغربی الاصل ھے ' اور اسی کی خاطر حامد نے مشرقی
عروض کو چھوڑ کر ' فرانسیسی طرز کے مخلوط قوافی استعمال کئے ھیں -
حامد کا اس طرح اوج کے ساتھہ دیہاتی فضاؤں کی تصویریں اُتارنا خاص
کر اس وجہ سے اور زیادہ قابل توجہ ھے کہ وہ شہروں کی زندگی '

ان کے شور شغب اور ان کی دلچسپیوں کا بہت شوقین تھا چنانچہ اپنی نظموں کے ایک مجموعہ " دیوانھلي کلمیرم " (میرا جنون شباب) میں اس نے انھی چیزوں کو بیان کیا ھے —

اس نے ایک منظوم قصہ " غرام " (جذبہ عشق) بھی لکھا ھے ' جس میں مذھب ' تصوف ' فنا وغیرہ کے متعلق اپنے خیالات ظاھر کئے ھیں —

اپنی پہلی بیوی کی وفات کا ' جو بیروت میں واقع ھوئی تھی ' حامد پر اتنا اثر ھوا ' کہ وہ خود کشی کرنا چاھتا تھا ' اور اس کے اعزا اقربا کو کامل چالیس دن تک اس کی نگرانی اور دیکھہ بھال کرنی پڑی - اس زمانہ میں اس نے مقبرہ کے عنوان سے اپنی بیوی کا ایک نہایت پر اثر اور دل ھلا دینے والا مرثیہ لکھا ' جو اس وجہ سے کہ اس میں رقت اور سوز و گداز کا عنصر بہت افراط سے تھا ' اُس زمانہ میں تو مقبول نہ ھو سکا ' لیکن اب اس نے ترکی ادبیات میں اپنی ایک مخصوص اور معزز جگہ پیدا کر لی ھے —

ترکی ادبیات کی تاریخ میں ایک اور نمایاں ھستی جو خاص کر ترکی ناول نویسی کے سلسلہ میں قابل ذکر ھے " سزائی بے " کی ھے - انھوں نے اپنی کتابوں ' ' کو چک شے لر ' (چھوٹی چھوٹی چیزیں) اور ' سر گزشت ' میں سب سے پہلی مرتبہ ایسے قصے لکھے جو بڑی بڑی حرم سراؤں اور ان کی کنیزوں کے حالات پر مبنی تھے - اگرچہ مصنف نے مشرقی زندگی کے اس رنگین رخ پر سخت سخت تنقیدیں کی ھیں ' تاھم ان کی قوت بیان بہت زبر دست ھے ' اور ان افسانو ں کے مختلف اجزا کے درمیا ن کما ل کا تسلسل پایا جاتا ھے - یہ ایک عیب اس میں بے شک ھے کہ لمبے چوڑے جملے لکھہ کر عبارت کو خراب کر دیا گیا ھے - یہ ناول تمثیلی نہیں ھے -

اور اس اعتبار سے پرانی شاھراہ سے الگ ھے ' بر خلاف اس کے یہ حقیقت پر مبنی ھے ' اور اس میں مصنف نے مشرقی زندگی کے متعلق ایک نیا تصور قائم کرکے جدت کا ثبوت دیا ھے

اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ادبیات کی یہ نئی روح پرانی روح کو ایک دفعہ ھی مٹا نہیں سکی - جس طرح اب تک ھم نے مشرق کو مغرب سے ملانے والی ادبی کڑیوں کو (خصوصاً صنف نظم میں) دیکھا ھے ' اسی طرح ھم کو ' ینی شہرلی اونی ' ' ھر سک لی عارف حکمت ' اور ' لس کات‌چلی غالب بے ' کے ناموں کو بھی نہ بھولنا چاھئیے ' ان لوگوں نے اپنا ایک مخصوص ادبی حلقہ قائم کرلیا تھا اور ترکی شاعری کی پرانی روایات پر ثابت قدم تھے - رجعت پسند طبقہ کا نمایندہ معلم ناجی تھا جس نے اپنے ادبی مشاغل کے ابتدائی دور میں نئے مذھب شاعری کے بے تکے پن ' خصوصاً اکرم اور عبدالحق حامد پر سختی سے تنقیدیں کیں۔ لیکن دوسرے دور میں ' جب وہ فرانسیسی زبان سیکھہ چکا ' تو ان ادبی بدعتوں کے متعلق اس کا رویہ' کسی قدر نرم ھو گیا ' اور خود اس نے کئی اعلیٰ درجہ کی نثر کی تحریریں ٹھیٹ ترکی زبان میں اور اعلیٰ درجہ کی فصاحت کے ساتھہ لکھیں ۔ ترکی زبان کی صفائی ' اور صرف ٹھیٹ زبان لکھنے کے متعلق اس کی رائے اس کے اس جملے سے معلوم ھوتی ھے :—

' اگرچہ ترکی زبان میں عربی و فارسی کے بے شمار '
' الفاظ ھیں ' لیکن ان کو صرف ایسے اجزا '
' سمجھنا چاھئیے جنھیں ترکی اپنے مخصوص '
' معنوں اور اپنے مخصوص تلفظ کے ساتھہ استعمال '

" کرسکتی هے " - *

اسی زمانے میں " ترجمان حقیقت " اخبار جاری هوا تها ' اور اس کے ادبی نقاد کی حیثیت سے انهیں اپنے هم وطنوں کو الفاظ کا صحیح استعمال سکهانے کا بہت کچه موقع حاصل تها - اپنی قوم میں وہ بجائے مصنف کے ' استاد زبان کی حیثیت سے زیادہ معروف تهے اور اسی وجه سے انهیں " معلم " کا لقب دیا گیا - ان کا خاص کار نامه یه هے که اپنے تنقیدی مضامین لکهه لکهه کر انهوں نے ' جوشیلے جدت پسندوں کی روک تهام کی ' جو اکثر اپنے جوش اختراع میں ادبی ذوق کی حد سے بهی متجاوز هوجاتے تهے - ان کی خاص خاص تصنیفات یه هیں :-

آتش پارہ (چنگاری) - اس کتاب کے ذریعه سے انهوں نے بقول خود —

" ویردم آتش دللرہ سوز دل آوارہ دن

ایلدم ایجاد به یک یا تمین بر آتش پارہ دن "

(ایک دل سوزاں و آوارہ سے میں نے کئی دلوں میں آگ لگائی ایک چنگاری سے هزاروں دیا سلائیوں کو جلا دیا)

" حمیت " کے عنوان سے انهوں نے " ارطغرل غازی " کی ایک منظوم تاریخ بهی لکهی هے - ان کے منظوم کلام کے مطالعه سے یه نتیجه نکالنا پڑتا هے که وہ کوئی بہت زیادہ بلند مرتبه شاعر نہیں هیں - ان کی نثر کی تصانیف مثلاً سنبله ' جو چهوٹی چهوٹی کہانیوں کا مجموعه هے اور بیچ بیچ میں کچهه نظمیں بهی هیں —— اپنی سلاست کے اعتبار سے خاص طور پر

---

* انشاالله خاں نے " دریائے لطافت " میں اردو زبان کے مختلف الاصل الفاظ کے متعلق بهی بعینه یہی رائے ظاهر کی هے —

قابل ذکر ھیں —

اس ادبی زندگی اور جدوجہد کے ساتھہ ساتھہ' انیسویں صدی میں ترکوں کے علوم بھی خواب غفلت سے بیدار ھوے - علم کے میدان میں سب سے اعلی اور افضل ذات ' احمد جودت ' کی تھی ' جو ماھر سیاسیات بھی تھا اور استاد اور مورخ بھی - اور اپنی زبان کی سب سے بڑی خدمت انھوں نے تاریخ ھی کے شعبہ میں انجام دی ھے' یعنی ان کی تاریخ ترکی جو بارہ جلدوں میں ھے اور سنہ ۱۷۷۴ ع سے سنہ ۱۸۲۵ ع تک کے زمانہ پر حاوی ھے - ترکی میں اس سے زیادہ مستند اور کوئی تاریخ نہیں اور اس کی زبان از اول تا آخر سیدھی سادھی اور تصنع سے بری ھے —

مغرب کی سمت سے جو ھوائیں آ رھی تھیں' انھوں نے ترکوں میں ایک خاص ادبی فضا پیدا کردی' اور انیسویں صدی کی رومانیت (Romanticism) سے مسحور ھو کر انھوں نے کمال شوق کے ساتھہ مختلف علوم کا مطالعہ شروع کردیا' اور ان میں ایک باکمال ذات ایسی پیدا ھوگئی جس نے اپنی قوم کی تلاش علم اور تفریح کی خواھش دونوں چیزوں کو پورا کردیا - یہ ذات ' احمد مدحت ' کی تھی - واضح رھے کہ ' احمد مدحت ' سیاست داں اور مدبر دوسرا شخص تھا - یہ ' احمد مدحت ' اپنے زمانہ کا قاموس نویس تھا - اسے ھر چیز کے متعلق تھوڑي بہت معلومات تھی' اور وہ اسے اپنے ھم وطنوں کو بھی فراھم کرنے کی کوشش کرتا رھتا تھا - جریدہ عسکریہ' 'جریدہ حوادث' اور ترجمان حقیقت کے مدیر کی حیثیت سے اس نے ھزاروں ھی مضامین لکھے' وہ نہایت پر نویس اور جامع الحیثیات تھا اور ھر موضوع پر' جس ضخامت کا مضمون اس سے کہا جاے لکھہ سکتا تھا - بحیثیت فلسفی کے' اس نے اپنی تمام تر توجہ رڈ مادئین پر مبذول رکھی' اور فلاسفہ مغرب کی

تردید سے تو اس کا قلم کبھی تھکتا ھی نہ تھا' اور اس موضوع پر اس کی تحریریں کئی جلدوں میں سما سکتی ھیں - اگرچہ بعض اوقات اس کا استدلال نہایت غیر فلسفیانہ ھوا کرتا تھا' لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اپنے زمانے میں (یعنی سنہ ١٨٨٠ اور اس کے قریب) اسی کی ڈھائی سو کتابوں نے ترکوں کے ذھنی جمود کو توڑا' اور انھیں تعمق اور تفکر پر اُبھارا - اس نے یہ ثابت کر دکھایا کہ اسلام کی اعلیٰ اور شریفانہ روح سائنس اور فلسفہ کی ترقی کے منافی نہیں ھے —

اگرچہ اسے ایک اعلیٰ درجہ کا ناول نویس نہیں کہا جا سکتا ' تاھم اس حیثیت سے بھی اس کی خدمات کچھہ کم قابل لحاظ نہیں ھیں - اس کی کتابیں' نہ صرف ترکی میں' بلکہ تمام ایشیا کی ترکی بولنے والی اقوام میں پڑھی جاتی تھیں - اگر ھم صرف اس کی ناولوں کے عنوانات ھی لکھیں' جن میں سے کچھہ ترجمے ھیں اور کچھہ اپنی خاص چیز' تو اسی میں کئی صفحات خرچ ھو جائیں - کم از کم ان کی تعداد ایک سو سے تو ضرور اوپر ھے - اگر وہ کسی ناول کا ترجمہ کرتا' تو اس میں اپنی طبیعت سے بھی کچھہ نہ کچھہ اضافہ ضرور کردیتا تھا - اس نے ترکوں کو پڑھنا سکھایا اور ان کے دلوں میں ناول خوانی کا شوق پیدا کیا - شروع شروع میں وہ خیالی اور جاذب توجہ قصے لکھا کرتا تھا' لیکن جب اس نے دیکھہ لیا کہ قارئین انھیں انتہائی شوق سے پڑھتے ھیں تو رفتہ رفتہ اس نے ناولوں میں حقیقت آمیزی اور تحلیل نفسی شروع کردی' تاکہ لوگوں کی اخلاقی تعلیم بھی ھوتی رھے' اور ان میں کمال پیدا ھوجائے - اس کے قصوں میں جتنے مجرم اور گنہ گار نظر آتے ھیں' وہ سب کے سب اپنے کیفر کردار کو ضرور پہنچ جاتے ھیں —

چونکہ وہ نہایت ہی وسیع المعلومات تھا، اس لئے اپنی ناولوں کے ذریعہ سے وہ اپنی قوم کا معلم اور استاد بن گیا - وہ مقابلہ میں فرانسیسی مصنف جو لس ورن سے کسي طرح کم نہیں ہے ' بلکہ کہیں کہیں تو تخیل آفرینی میں وہ اس سے بھي آگے نکل گیا ہے - اس کی اکثر ناولوں کے واقعات دور دراز ممالک کے ہیں ' مثلاً امریکہ ' برےزیل ' ہندوستان وغیرہ ' اور ان ملکوں کے باشندوں کے عادات ' رسم و رواج وغیرہ کے جو حالات اس نے لکھے ہیں وہ ترکي قارئین کے لئے مدرسوں کی جغرافیہ کی تعلیم سے کہیں زیادہ سود مند ہیں - اس کی تیز نویسی کا ایک قابل افسوس نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اس کا طرز تحریر عامیانہ ہے اور قدیم ادبی معیاروں تک نہیں پہنچتا ' لیکن غالباً اپنے طرز کی اسی خصوصیت کی وجہ سے وہ اتنا مقبول بھی ہوا ' اور پڑھنے والوں پر اتنا زیادہ اثر ڈال سکا —

لسانیات کے شعبہ میں جس شخص نے شہرت پیدا کی ' وہ ' احمد وفیق پاشا ' تھا ' وہ مدبر تھا ' لیکن تحریر کا ایک خاص مذاق رکھتا تھا ' اور اپنی فرصت کے اوقات میں اس نے ایسی ایسی لسانیاتی کتابیں تصنیف کیں ' جو ترکوں کے لئے نہایت اہم اور ضروری تھیں - وہی سب سے پہلا ترکی ماہر لسانیات تھا ' جس نے یورپی ماہرین السنہ مثلاً ردھاوس (Redhouse) کے اصول تحقیق پر کاربند ہوکر ایک ترکی لغت " لہجہ عثمانیہ " مرتب کی ' اور " جگتاے لغاتی " یعنی وسط ایشیا کی ترکی زبانوں کی ایک شرح لکھي - اپنی ان تصنیفات کے ذریعہ سے ' اس نے عثمانی ترکوں میں نسل پرستی کا احساس پیدا کیا ' اور ان کے دلوں میں جذبہ توران خواہی کی بیداری میں حصہ لیا - اس نے " ابوالغازی بہادر خاں " کی ' شجرات ترک ' کا بھی ترجمہ

کیا - لیکن مذکورہ بالا ادبی خدمات سے بھی کہیں زیادہ قابل قدر اس کے وہ اعلیٰ درجہ کے تراجم ہیں' جو اس نے فرانسیسی کتابوں کے کئے - اگرچہ اس سے پہلے بھی یوسف کیامل پاشا نے ' فےنی لان (Fenelon) کی مشہور کتاب تے لی ماک (Telemaque) کا ترجمہ کیا تھا ' لیکن اس میں مغلق اور متروک الفاظ و عبارات کی کثرت تھی ' اس کے مقابلہ میں احمد وفیق پاشا کے تراجم آج تک ترکی زبان کے کلاسک بنے ہوئے ہیں - اس نے مولی یر (Moliere) کے ناٹکوں کو اس طرح پر " اپنایا " کہ ان کے ہیروؤں کو بطور نمونہ لے کے انھیں ترکی بساط پر بٹھا دیا - اب ترکی میں یہی فیشن ہوگیا ہے کہ غیر ملکوں کے ناٹکوں کو اپنالیا جاے ' یعنی خاص خاص افراد قصہ کی سیرتیں وہی رہیں - جو اصل میں تھیں ' اور قصہ کا عام رنگ بھی وہی ہو ' لیکن افراد قصہ کو ترکی نمونوں میں اور غیر ملکی ماحول کو ترکی ماحول سے بدل ڈالا جاے * - البتہ یہ بات کسی قدر افسوس ناک ہے کہ یہ تراجم اسٹیج پر نہ دکھائے جاسکے - عبدالحق حامد کو بھی ہر نئی چیز کی طرف سے کچھ ایسا خوف (جدت ترسی !) تھا کہ ترکی میں اسٹیج کے قابل کھیلوں کی ترقی نہ ہوسکی ' بلکہ زیادہ تر ناٹک صرف

---

* اردو کے افسانہ نویس بھی اگر اسی اصول پر کاربند ہوں تو بہتر ہے - خاکسار نے بھی مولی یر کے ڈرامے (Forced Marriage) کو " نکاح بالجبر " کے عنوان سے ' علیٰ ھذا گوگول کے ڈراموں " Marriage " اور " Inspector - General " کو نیز چخوف کے چند افسانوں کو اپناکر اس کا تجربہ کیا ہے ' اور اکثر احباب اور نقادان فن نے انھیں پسند کیا ہے یہ ڈرامے اسٹیج پر بھی دکھاے جاچکے ہیں —

۱۲ - مترجم

کتابی صورت ھی میں رھے —

اس دور کے مورخین میں 'مراد بے' سب سے بڑا ھے - چونکہ اصل کے اعتبار سے وہ روسی ترک تھا' اس لئے تاریخ کے غیر ملکی مآخذ تک بھی اس کی دست رس تھی - اس کی ضخیم کتاب تاریخ عالم جو چھ جلدوں میں ھے' فاحش اغلاط سے پر ھے' علی ھذا اس کی تاریخ آل عثمان میں جس کا عنوان " تاریخ ابوالفاروق " ھے قیاسی کلیات اور تعمیمات سے بہت زیادہ کام لیا گیا ھے - ایک عرصہ تک' یعنی اس وقت تک جب کہ نئی انجمن تاریخ نے ترکی تاریخ کے مآخذ کی طباعت شروع کرکے تقابلی مطالعہ تاریخ کے علمی اصول قائم نہیں کئے تھے —— 'مراد بے' کی تاریخ ھی مستند ترین سمجھی جاتی تھی —

اسی سلسلہ میں ' ابوالضیا توفیق ' کا ذکر کرنا بھی ضروری ھے' اس لئے کہ وہ چاھے بلند پایہ مصنف کی حیثیت سے معروف نہ ھو' تاھم ایک پر جوش وطن خواہ اور واقف فن ناشر کتب کی حیثیت سے ضرور ممتاز ھے - تمام بڑے بڑے ترکی مصنفین کے ساتھ اس کے دوستانہ تعلقات تھے' اور اس نے ان کی تصنیفات کو جس اھتمام اور خوش ذوقی کے ساتھ شایع کیا ھے' اس کا جواب ترکی طباعت میں آج تک پیدا نہیں ھوا ھے - اس کی کتاب " نمونۂ ادبیات" تاریخ ادبیات ترکی کا سب سے پہلا نمونہ ھے - شمس الدین سامی' یعنی قاموس سامی کے مشہور مدون نے بھی اپنی کتاب میں عربی اور فارسی محاورات کے علاوہ عوام کی بول چال اور محاورات کے نمونے جمع کئے ھیں اور اس حیثیت سے اس کی قاموس زبان کے متعلق ایک اعلی درجہ کی حوالہ کی کتاب اور سند کا حکم رکھتی ھے —

ترکی جمہور کی بیداری اگر چہ آھستہ آھستہ اور بتدریج ھوئی' لیکن

اس کے ساتھہ ساتھہ قطعی اور واقعي بھی تھی - حوداث کے تازیانہ نے اس کے روحانی جمود کو توڑا، مثلاً عیسائی رعایا میں قومی احساس کا پیدا ھو جانا اور حقوق کے مطالبات، سیاسی مظالم کی کثرت، جن کی بدولت، عبدالحمید کے زمانے میں مصنفین جلا وطن کئے گئے اور اس طرح ان سے یورپی تخیلات و افکار کا غیر معمولی شوق پیدا ھوگیا - قوم کے بہترین دماغوں نے بھی اس نئی روشنی کی صرف ھلکی سی جھلک دیکھی تھی، اور اسی لئے جن خیالات کا انھوں نے اپنی تصانیف میں اظہار کیا، ان میں بھی ماضی کی یادداشتیں بکثرت نظر آتی ھیں - جس دور کو اصلاحی دور کہا جاتا ھے، اس میں قوم پرستي کو خلافت کا مرادف سمجھا جاتا تھا - خود عبدالحق حامد نے اپنے ڈراموں میں اندلس کے حالات لکھے ھیں، اور اسے محض اس وجہ سے ایک قومی موضوع بحث قرار دیا ھے کہ یہ ایک اسلامی چیز تھی - اسلام اور تحریک عثمانیت یہ دونوں مل کر ایک تصور ھوگئے ھیں اور ترکی کے روشن خیال مصنفین کا تخیل قومی آزادی کے متعلق ھمیشہ یہ رھا ھے کہ اسلام کی عظمت رفتہ کو زندہ کرکے اور خلفاے عثمانی کی سرکردگي میں، یورپی علوم اور یورپی مذاق کے ذریعہ قوم کو آزاد کیا جاے - ان لوگوں کی معلومات مشرق کے متعلق غالباً اتنی ھی غیر مکمل اور ناقص تھی، جتنی کہ مغرب کے متعلق - لیکن اس کے ساتھہ ھی ان کی نیت نیک تھی، اور انھوں نے خلوص اور صدق دل کے ساتھہ اس کی کوشش کی کہ زندہ رھیں، اور دریاے ڈینوب (Danube) سے لیکر خلیج فارس تک ملت اسلامیۂ عثمانی پر جو روحانی بے حسی طاری ھوچکی تھی، اسے دور کریں - فلسفہ تاریخ کی رو سے یہ بات محال نظر آتی ھے کہ ایک ایسا زبردست انقلاب، جیسا کہ سلطنت عثمانی کی روحانی اور سیاسی زندگی میں ھونے والا تھا، دفعتاً ھوجاے- یہ

نہیں ہوا، بلکہ ایک درمیانی زمانہ ایسا گزرا ہے جس میں قدیم اور جدید کا سنگم ہوا، پرانے اور نئے دونوں زمانوں کی کوتا ہیاں ایک دوسرے سے مل گئیں، اور یہ درمیانی دور گویا اس بات کی قطعی ضمانت تھی کہ ہنوز ترکوں کی روحانی تاریخ کا خاتمہ نہیں ہوا ہے - اس دور میں اخبارات جاری ہوے، ترکی بحروں میں نئی شاعری شروع ہوئی، ناول اور ڈرامے تصنیف ہوے، ان میں سے ایک چیز بھی ایسی نہ تھی جو فرانسیسی اصل سے (جس کے یہ سب نمونے تھے) بڑھی چڑھی ہو- ترکی زبان بہت زیادہ انگھڑ تھی، اور اس پر صدیوں سے پرانا رنگ چڑھا ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ ان نئے اور غیر مانوس خیالات اور احساسات کے اظہار کا اچھا ذریعہ نہ بن سکی - تاہم ترکوں نے کوشش میں کمی نہیں کی اور ضیا پاشا کے زمانے سے لیکر عبدالحق حامد کے دور تک جس قدر ترقی ہوئی، وہ واقعی تعجب خیز ہے - نوجوان مصنفین کے دل جوش اور فتح مندی کے احساس سے لبریز تھے، اور جب سلطان عبدالحمید کو معزول کیا گیا، تو تاریخ کے استیج پر ایک نئی ترکی قوم نے قدم رکھا - اس نئی قوم کو سخت سے سخت ناکامیوں اور شدید سے شدید مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا - جنگوں کے لاتناہی سلسلے اور اقتصادی مشکلات کی وجہ سے اس کی صفیں کی صفیں تہ و بالا ہوگئیں، لیکن مصائب کے باوجود ترکی روح فنا نہیں ہوئی، ترک بدستور اپنی شاندار شاہراہ ترقی پر گام زن رہے، اور انھوں نے اگلے زمانہ کے مقابلے میں کہیں زیادہ شاندار کام کر دکھاے - انھوں نے ان ذہنی بندھنوں کو جو متقدمین سے انھیں ورثہ میں ملے تھے، توڑنا شروع کیا، اور تہذیب و شائستگی کے ایک نئے شاندار اور تاریخی دور میں داخل ہوئے - بالآخر قومی احساس بیدار ہوکر رہا !

ترکی ادبیات کا احیا

(۳)

(نوشتہ پروفیسر جولی یس جرمانوس)

مترجمہ سید وہاج الدین صاحب لکچرار اورنگ آباد کالج

جس طرح سلطان عبدالحمید کی ذات اپنی عجیب و غریب نفسیاتی پیچیدگیوں کی وجہ سے ، ترکی کی تاریخ میں ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہے ، اسی طرح اس کے عہد حکومت سے ترکی ادبیات کا بھی ایک نیا دور شروع ہوتا ہے - اس کے مخالفین ، یعنی نوجوان ترک ، اسے صرف ایک سنکی اور ظالم بادشاہ سمجھتے تھے ، انھوں نے اس کی اس سیاسی صلاحیت کو پوری طرح نہیں سمجھا ، جس سے کام لیکر وہ حوادث و واقعات کی بڑھتی ہوئی رو کو روکتا اور تھامتا رہا - افسوس ہے کہ اس کی یہ مایوسانہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی - سلطان عبدالحمید ، اپنے عہد حکومت کے شروع میں مشروطہ کا حامی تھا ، لیکن بعد کو انتہائی قدامت پرست بن گیا - اس نے پہلے ہی سے سمجھہ لیا تھا کہ ترکی کے جیسے ملک میں ، جہاں عیسائی اور مسلمان ، یونانی ، ارمنی ، یہودی ، البانی ، عرب ، کرد ، شامی سب کے دلوں میں اسی قسم کی قومی بیداری کا احساس پیدا ہوگیا تھا ، جیسا کہ خود ترکوں میں ، پارلیمنٹری نظام حکومت چلنے والا

نہیں ہے - وہ جانتا تھا کہ ایک ایسا ترقی پسند ' عثمانی اسلام ' جس کی حمایت میں دوسری قومیتیں بھی مساوات کے ساتھہ زندگی بسر کرسکیں اسی صورت میں پیدا ہوسکتا ہے کہ انتہائی قدامت پسندی سے کام لیا جائے - اس قدامت پسندی کی پالسی کا خاص مقصد یہ تھا کہ سلطنت ترکی کو ایک (نام نہاد) سلطان کی شخصی حکومت کے مرکز پر قائم رکھا جائے ' جو جمہوریت کے اصول پر تمام رعایا کے ساتھہ یکساں برتاؤ کرے ' لیکن معاملات سلطنت میں انہیں دخیل نہ کرے - اس نے پارلیمنٹ کو برخاست کر دیا ' اس لئے کے وہ رعایاے ترکی کے متضاد اغراض کی کش مکش سے عہدہ برآ ہونے سے لاچار تھی ' اور نہ اس کي قابلیت رکھتی تھی - اس نے کوشش کی کہ قوم خواہوں کی سیاسی جماعتوں کو ' قبل اس کے کہ وہ علانیہ میدان میں آ جائیں ' توڑ ڈالا جائے - وہ سلطان " عبدالعزیز " اور سلطان " مراد " کی معزولی سے اتنا سہما ہوا تھا ' اور خود اپنے معزول کر دئے جانے کا خوف اس کے دل و دماغ پر اس طرح حاوی ہوگیا تھا کہ اس نے اس روز بد سے بچنے کے لئے ' نظام حکومت کی ایسی ایسي خیالی تجویزیں سوچیں ' جو اپنی بعض حیثیات میں اتنی ہی مہمل اور خبط تھیں ' جتنی کہ ان کی مستبدانہ روح اس وقت کے حالات کو دیکھتے ہوئے ' جائز کہی جا سکتی تھی - وہ ترکی بیڑے کے ڈر سے کانپتا رہتا تھا ' لہذا اس نے اسے بھی توڑ ڈالا - اس نے ایسے ایسے لوگوں کو مقربین بارگاہ بنایا ' جو وفادار اور خوشامدی تو ضرور تھے ' لیکن بدقسمتی سے اس دیانت اور ایمانداری سے خالی تھے ' جو ایک مضبوط مرکزی حکومت کے لئے بمنزلۂ لوازمات ہوا کرتی ہے - وہ اپنے صاحب حشمت و شوکت اسلاف کی طرح مستبدانہ طریقہ پر حکومت کرتا تھا ، لیکن نہ اس میں ان کی

سی حشمت تھی اور نہ شوکت - اس نے اخباروں کی زبان بندی کردی ' اور پبلک کی آواز کا گلا گھونٹ دیا —

وہ چاھتا تھا کے صرف میں ھی پوری سلطنت کا مالک و مختار رھوں ' اور صرف میرے ھی احکام واجب التعمیل ھوں ' لیکن اسے ایسے کام کے آدمی نصیب نہ ھوے ' جو اس کی پالسی کو دیانت داری کے ساتھہ چلاتے ' اور وہ اپنی رعایا کے دلوں میں یہ خیال بھی پیدا نہ کرسکا کہ ایک ایسی سلطنت میں جو مختلف قومیتوں پر مشتمل ھو ' قومیت کی تباہ کن قوتیں بغاوت اور بدامنی پیدا کر کے رھتی ھیں - تاریخ شاھد ھے کہ آج تک کوئی مستبد جمہور کے خیالات کی رو کے مخالف نہیں جاسکا ھے ' اور پھر سلطان عبدالحمید کی پالسی کسی طرح بھی منصفانہ ' یا عاقلانہ استبداد کی پالسی نہ تھی - نوجوان ترکوں کی پارٹی اس کی سب سے بڑی دشمن تھی ' اور اس نے اس کی کئی مرتبہ کوشش کی کہ ظلم و تعدی کے زور سے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی اس جماعت کا قلع قمع کردے ' جو وطن پرست ضرور تھے لیکن جن کی وطن پرستی پر شاعرانہ خیال آرائی اور مثالیتؔ غالب تھی - " انجمن اتحاد و ترقی " پر کوئی صحیح اور قابل ثبوت الزام نہیں عاید کیا جاسکتا - یہ صحیح ھے کہ وہ عملی حیثیت سے ماھرین سیاسیات نہ تھے اور اسی وجہ سے واقعات کی رفتار کو قبل از قبل نہ سمجھہ سکتے تھے - وہ ایک ایسے ملک میں فرانس اور سوئٹزر لینڈ کے آئینی نظام حکومت کی نقل کرنا چاھتے تھے ' جو تاریخی حیثیت ' جغرافی محل وقوع ' اور تہذیب و شائستگی کی سطح کے اعتبار سے ان دونوں سے بالکل مختلف تھا - لیکن ھمیں یہ بھی یاد رکھنا چاھئیے کہ دنیا میں ایسا سیاسیات داں ' یا وطن پرستی کے خواب

دیکھنے والا شاذ و نادر هي ملتا هے جو اپنے نظری قیاسات کے عملی نتائج کو قبل از قبل دیکھه سکے، اور یه نظری قیاسات عموماً ایک اهم ترین جز، یعنی باشندوں کے روحی عنصر کو بالکل نظر انداز کردیتے هیں - اپنے ان اخبارات میں جو یورپ میں شایع هوتے تھے، اور خفیه طور پر جن کی اشاعت ترکی میں بھی هوتی تھی، نوجوان ترک بڑی جرات کے ساتھه سلطان عبدالحمید کی صلح پسند پالسی پر حملے کرتے تھے، اور اس پر یه الزام عائد کرتے تھے که اس نے رعایاے ترکی کے محبوب ترین اغراض و مفاد کو اس پالسی پر قربان کردیا هے - اس قسم کی نکته چینیوں سے خائف هوکر سلطان عبدالحمید کا جابرانه رویه اور سخت هو جاتا تھا - متوسط طبقه پر اس ظلم و تعدی کا ایک نهایت افسوسناک اثر یه پڑا که ان کے مزاجوں میں خوشامد پسندی پیدا هوگئی، جس نے حیات اجتماعی کو اور زیاده ناقابل برداشت بنادیا - کسی شخص کو اپنے کھرے سے کھرے دوست کی طرف سے بھی یه اطمینان نه تھا که وه حکام کی رضا جوئی یا چند روپیوں کے لئیے ان کی مخبری نه کردے گا - اس زمانه میں ایک ضرب المثل تھی:

"پادشاهی مز سیاسنده خے پی مز جاسوسوز"

یعنی "هم سب اپنے بادشاه کے جاسوس هیں" -

ظاهر هے که ایک ایسی حیات اجتماعی میں جس کے افراد کو همه وقت ایک نه ایک خدشه لگا رهے آزاد ادبیات پیدا نهیں هوسکتی - سنه ۱۸۷۰ع اور اس کے قریبی زمانے کے مصنفین کی کتابیں قابل ضبطی قرار دی گئیں، فرانسیسی ناولوں اور پیرس کی عیش پسندیوں نے طبقه اعلیٰ کے تخیلات پر قبضه جمالیا اور ساری ترکی جمهور پر ایک عجیب قسم کا خمار اور جموده طاری هوگیا - بعض هفته وار اخبار اس جمود کے خلاف احتجاج بھی کرتے تھے - ان میں اکثر یورپ کے هفته وار اخباروں کی تصویریں نقل کی جاتی تھیں اور ان کے نیچے

نوجوان ترک تصویروں کو سمجھانے کے لئے اشعار لکھا کرتے تھے - "مکتب" اور "خزینۂ فنون" اسی قسم کے اخبارات تھے - اس بحث کے سلسلہ میں کہ لفظ 'عبث' کا قافیہ 'مقتبس' ہوسکتا ہے یا نہیں، ایک اور اخبار یعنی "ثروت فنون" منظر عام پر آیا جس کے مدیر "توفیق فکرت" تھے اور وہ بہت جلد ترکی کے سب سے زیادہ مقبول شاعر بن گئے - ان کی جدید طرز کی اور جسارت آمیز نظموں نے، جن میں پردے ہی پردے میں ظلم و استبداد پر چوٹیں ہوتی تھیں، نوجوانوں کے دلوں کو مسخر کرلیا - ان کا اسلوب بیان تمثیلی ہوتا تھا، اور فرانس کے "پارنسی"* (Parnassian) طرز کی جھلک اس میں پائی جاتی تھی - وہ اپنی نظموں کے موضوع زندگی کے مختلف پہلووں میں سے انتخاب کرتے تھے - ان کی نظمیں جو "ثروت فنون" میں نکلتی رہتی تھیں سنہ ۱۸۹۶ ع میں کتابی شکل میں "رباب شکستہ" کے عنوان سے شایع ہوئیں ترکی نظم کی کسی تصنیف کو وہ مقبولیت نصیب نہ ہوئی جو اس مجموعہ کو ہوئی - ایک سال کے اندر ہی اندر اس کے تمام نسخے ہاتھوں ہاتھ بک گئے، اور بازار میں یہ کتاب نایاب ہوگئی - فکرت کے مداح ہر جگہ ان کی نظموں کے اشعار پڑھتے تھے، اور اس شہرت ہی کی وجہ سے پولیس اُن کی طرف سے بدظن ہوگئی، انھیں گرفتار کرلیا گیا اور ان کے هفته وار اخبار کو بند کردیا گیا - وہ تو کہئے کہ ایک امریکن کالج یعنی رابرٹ کالج میں پروفیسری کی خدمت انھیں مل گئی، اور اس طرح سر چھپانے اور روٹی کھانے کا ذریعہ میسر آیا، اب وہ عزلت پسندی کی زندگی بسر کرنے لگے - اس کے بعد سے ان کی کوئی نئی

---

* یہ ایک فرانسیسی مذهب ادبیات تھا، جن کا اصول "L' Art pour l' art" یعنی "فن برائے فن" تھا - اس رنگ کے مقلد شاعری میں اپنے ذاتی احساسات یا موعظت و اخلاق کو دخل دینا گناہ سمجھتے تھے، ان کا نصب العین صرف حسن صورت اور حسن معنی ہوا کرتا تھا - ۱۲ مترجم -

نظم شایع نہیں ہوئی ' لیکن ان کے احباب اُن کی تازہ نظموں کی نقلیں حاصل کر کے انہیں زبانی یاد کر لیا کرتے تھے - فکرت کی ذات اپنے ہم وطنوں کے ادبی ضمیر کا آئینہ تھی - انھوں نے نوجوان ترک پارٹی کے لئے ایک نظم " ملت سر کیسی " " قومی گیت " لکھی تھی جس نے اس طبقہ کے دلوں میں وطن کی گہری محبت اور مستقبل کے لئے اُمیدیں پیدا کردیں - کہتے ہیں :-

ملت یولیدر حق یولیدر طوتدیغمز یول

اے حق یاشا اے سوکیلی ملت یاشا وار اول

ظلمت طوپی دار ' کله سی دار ' قلعه سی دار سه

حقاے بو کولمز ' قولی دو نمز یوزی وار در

" ہمارا راستہ حق اور ملت کا راستہ ہے -

مبارک ہے حق ' مبارک ہے ہماری پیاری محبوب ملت

ظلم کے پاس توپیں ہیں ' گولیاں ہیں ' قلعے ہیں

" حق کے پاس خم نہ کھانے والا بازو ' ہار نہ ماننے والا ایمان ہے "

یہ ترانہ اثر کئے بغیر نہ رہا - نوجوان ترکوں نے فوج کو ہموار کر کے سلطان عبدالحمید کو ہار ماننے پر مجبور کرا دیا اور اس سے دوبارہ مشروطہ عطا کرنے کا اعلان کروایا - فکرت شاعر سے کہیں زیادہ فن شعر میں صاحب فن تھا - اگرچہ اس نے اپنے طرز اور زبان میں اختراعیں اور بدعتیں کی ہیں ' لیکن حسن صورت کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیا - اس کی نظمیں ایسی مکمل اور ترشی ہوئی ہیں کہ انہیں جواہرات کی لڑیاں کہا جائے تو مبالغہ نہیں - وہ کبھی خالص ترکی زبان لکھتا ہے ' اور کبھی کبھی ترکی ادبیات نے ماضی کی یاد کو زندہ کرنے کے لئے فارسی زبان کی موسیقیت سے کام لیتا ہے —

سلی پرو دھامے (Sully Proudhamme) اور لے کانتے ڈلیل (Le Conte de Lisle) کا اثر فکرت پر بہت غالب ہے اور " رباب شکستہ " میں ان دونوں کے ترکی بول صاف سنائی دیتے ہیں - لیکن چاھے اس " رباب شکستہ " کے سر دھیمے ھوں ' لیکن اس کا راگ مسلسل ہے - وہ اپنے موضوع کے اعتبار سے بحروں کا انتخاب کرتا اور ان میں رد و بدل کر دیا کرتا تھا - مثلاً دیکھئے کہ اپنی نظم " رقص مار " میں وہ رقص کی مختلف حرکتوں کے اعتبار سے بحر کو کس طرح بدل دیتا ہے :—

صنعت ' صاحی سور پنپہ یشیل قیر سیزی سائی

الوان ضیائیہ بر قدرت جولان

بخش ایلییرک ھپسی پریلر کبی مخفی

مخفی و سکونتلی آدیملرلہ شتابان

اطرافنی بردن صاری پور لر اوسمائی

برتودۂ از ھار مخیل کبی لرزان

لرزان و پریشان بر شب صافی

تمویر ایدییور صانکہ بر آویزۂ رقصان

" صنعت ' تحریک رقص دیتی ہے "

" روشنی کے زرد ' گلابی ' قرمزی ' سبز ' سرخ "

" اورنوبلے رنگوں کو یہ سب کے سب ' نظروں سے اوجھل "

" پریوں کی طرح جوت پت جگہ کو گھیر لیتی ھیں ' لرزان "

" مثل اس خیالی گلدستہ کے جو آسمان سے پھینکا گیا "

" ھو - لرزان اور ایک دوسرے میں گھل مل کر وہ رقص "

" کرتی ھیں اور ایک رقصان آویزہ (جھاڑ) کی طرح "

صاف روشنی میں اپنی تنویر پیدا کرتی ھیں " فکرت کا سب سے بڑا کمال ان کی قدرت زبان ھے - ایسا معلوم ھوتا ھے کہ ان کے ھاتھہ میں آکر زبان ایک نہایت کار آمد اوزار اور ان کی مرضی کی تابع بن جاتی ھے —

یہ ایک عجیب بات ھے کہ زندگی میں اس قدر مقبول اور ھردلعزیز ھونے کے باوجود فکرت کی موت کے بعد ھی بہت جلد ان کے فصیح سے فصیح اشعار بھی زبانوں اور دلوں سے محو ھونے لگے - زندگی بھر تو وہ لوگوں سے ادب اور احترام کا خراج وصول کرتے رھے ' لیکن ان کی آنکھہ بند ھوتے ھی کئی طرف سے نکتہ چینوں کی زبانیں کھل گئیں - آج کل تو اکثر لوگ ان کو اعلیٰ درجہ کا شاعر ماننے میں بھی تامل کرتے ھیں اور ان کے " رباب شکستہ " کو ایک پھٹا ھوا ربابہ کہا جاتا ھے جس میں سے کوئی سر تال نکلتا ھی نہیں !

شاعری جس موسیقیت کی نمائندہ تھی ' وہ بہت جلد افسانوں اور ناولوں میں بھی پیدا ھوگئی ' اس صنف میں سب سے زیادہ کمال خالد ضیا نے پیدا کیا - میں پہلے کہہ چکا ھوں کہ ترکی ناول نویسی کا باوا آدم سزائی بے تھا ' جس کی تصنیف " کوچک شے لر " (چھوٹی چھوٹی چیزیں) ھے - یہی " کوچک شے لر " اور دوسری کہانیاں خالد ضیا کی دلیل راہ بنیں ' اور وھی ترکی کا پہلا قومی افسانہ نگار ھوا - ان کے اس افسانہ کا نام " ملی " ھے اور اس کی وجہ تسمیہ یہ ھے کہ اس میں قومی مباحث و موضوعات سے بحث کی گئی ھے - ترکی معاشرت پر جو حالت جمود و خمار طاری تھی ' اسی کے قصہ اور افسانہ خمار شکن اور تفریح آور ثابت ھوئے - ترکی نثر کی تاریخ اتنی قدیم نہیں ھے جتنی ترکی نظم کی - اس لئے جدید طرز کے افسانوں کے لئے گویا ایک نئی نثر پیدا کرنی پڑی '

اور ترکی مصنفین نے اس کی بے انتہا کوشش کی کہ وہ جمہور کے مذاق پر پورے اتریں اور ساتھ ھی ایسی زبان بھی لکھیں جو جدید خیالات اور قصوں کے بیان کرنے کے لئے موزوں ھو - خالد ضیا کی زبان ان دونوں خصوصیات کا سنگم ھے - وہ مصنوعی اور دقیق بھی ھے' اور ساتھ ھی اظہار جذبات کی صلاحیت اور زور بھی اس میں پایا جاتا ھے- ایک طرف اس کا طرز قدیم طرز کو یاد دلاتا ھے' تو دوسری طرف اس کے قصے آج کل کی جیتی جاگتی تصویریں ھیں —

اپنے پیش رووں کی طرح' خالد ضیا کی تربیت بڑی فرانسیسی ادبیات کی فضا میں ھوئی تھی - اس زمانہ میں محیرالعقول داستانوں اور جرائم کے قصوں کا بہت زیادہ زور تھا - بچپن ھی سے خالد نے تو ماس خورد * اور آکیٹو فوا ے لے کی ناولیں پڑھنا شروع کردی تھیں جنھوں نے اس کے مذاق کو سنوارا اور کلاسک طرز کی ناولوں کی طرف اس کی رھبری کی - سولہ برس کی عمر ھی میں وہ ادبیات کا پر جوش محصل بن چکا تھا اور اس نے ایک تاریخی تصنیف کا مقدمہ شایع کیا جس میں "مغرب سے مشرق کی طرف ادبیات کے سفر" سے بحث کی گئی تھی - یہ نوجوان طالب علم بہت جلد ایک ھونہار ادیب بن گیا - اس کی پہلی ناول محکمہ احتساب کی طرف سے قابل ضبطی قرار دی گئی' اور اس نے اس کے مسودہ کو جلا دیا - اس کی سب سے پہلی مطبوعہ ناول "نومیدہ" جس وقت شایع ھوئی ھے' اس وقت اس کی عمر ۱۸ سال کی تھی - اس کی مقبولیت نے اس کے ادبی جوش کو اور تیز کردیا' اور اس کے تھوڑے ھی عرصہ بعد ایک اور ناول "بیر الوسون دفتری" (ایک مردہ شخص کی بیاض) کے عنوان سے نکلی' اور اس کے بعد ھی تیسری ناول فردی و شرکاء (فردی اینڈ کمپنی) شایع ھوئی- خالد ضیا ھی پہلا مصنف ھے جس نے سب سے پہلے نئے طرز کے مختصر افسانے

---

* خورد اس وجہ سے کہ اس نام کے دو مصنفین باپ اور بیٹے ہوے ھیں۔ ۱۲ مترجم

لکھے, مثلاً "ایک بیاض کے آخری صفحات" "محبت کي شادی کا قصہ" " کیا یہ ٹھیک ہے" وغیرہ - اس کے ساتھ ھی اس نے کئی درجن فرانسیسی ناولوں اور مختصر افسانوں کا ترجمہ بھی کیا - اس زمانے کے فرانسیسی ادبی رنگ میں ترکی ناولیں لکھنا آسان بات نہ تھی - تقریباً ہر پڑھا لکھا ترک فرانسیسی بولتا تھا ' اور فرانسیسی زبان کے ترجمہ اس کثرت سے ہوے تھے کہ ملک منتخب سے منتخب فرانسیسی افسانوں سے روشناس ہوچکا تھا - ترکی مصنف کا سب سے بڑا حریف فرانسیسی مصنف تھا' اور اس کو اگر اس سے بڑھنا نہیں تو کم از کم اس کی برابری ضرور کرنی پڑتی تھی - جدید عربی ادبیات میں بھی جس نے آج کل یوروپی طرز ادا کو اختیار کرناشروع کردیا ہے' ہم زبان کی یہی مشکلات پاتےھیں' یعنی اسے بھی اپنے کمال کے اظہار کے لئے ھاتھہ پیر مارنے پڑتے ھیں' اور حالانکہ یوروپی ادبیات کے بعض بہترین‌شاھکار عربی میں ترجمہ ھوچکے ھیں لیکن اب تک کوءی ممتاز عربی ناول نویس نہیں پیدا ھوا ہے - پس اسے ترکوں کی ذھانت کا ایک کمال سمجھنا چاھئے کہ وہ اپنے فرانسیسی حریف کا مقابلہ کرسکے' اور اپنے قومی افسانے لکھہ سکے - خالد ضیا ان با کمال ادیبوں میں سے تھا جنھوں نے اپنے ملک کی بیش بہا خدمتیں کي ھیں ۔ وہ اتنا جامع الکمالات اور صاحب حیثیات تھا کہ سائنس اور افسانہ دونوں موضوعوں پر اس نے قلم اُٹھایا ہے - اس نے سنسکرت کی ادبیات پر بھی ایک رسالہ لکھا تھا ' لیکن محکمہ احتساب نے اس شبہہ پر کہ اس میں درپردہ سیاسی بحثیں کی گئیں ھیں ' اسے گرفتار کرلیا - گرفتاری کے بعد ایک پولیس کے افسر نے اس سے کہا کہ "تم با غیانہ خیالات کی اشاعت ایسے دقیق طرز عبارت میں کرتے ھو کہ خفیہ کا محکمہ بھی اسے نہیں سمجھہ سکتا" اس پر خالد نے جواب دیا "کہ پھر ایسی کتاب سے کیا نقصان پہنچ سکتا ہے جسے خود آپ بھی نہیں سمجھہ سکتے" اس کی خانہ تلاشی لی گئی ' اور

اس کے خطوط ضبط کر لئے گئے - اس ظلم و جبر کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت دنوں کے لئے اس نے قلم ہاتھ سے رکھدیا - اور اس واقعہ کے تین سال بعد اس کی ایک نئی ناول اخبار ”ثروت فنون“ میں چھپی - اس ناول سے جس کا عنوان ”مائی و سیاہ“ (نیلا و کالا) تھا اس کی ادبی زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے یہ ناول ایک نئی چیز تھی اور اس کے ساتھ ہی اس پر نویس مصنف نے دوسرے روزانہ جرائد میں مختصر افسانوں کا ایک سلسلہ بھی لکھا جو بعد کو ”سول گون د ست“ (گلدستۂ پژمردہ) اور ”بریازن تارھی“ (گرمیوں کی کہانی) کے عنوانوں سے علحدہ کتابی شکل میں شائع ہوے - ”ثروت فنون“ کے بند ہو جانے سے ادبی بار آوری کا یہ زمانہ ختم ہوگیا - اس کی دو اور مشہور ناولیں ”عشق ممنوع“ اور ”کیرک حیاتلر“ (شکستہ زندگیاں) بھی اسی اخبار میں نکلی تھیں - مشروطہ کے اعلان کے بعد خالد پر سے بھی حکم زبان بندی اٹھا لیا گیا، اور اب وہ آزادی سے اپنے جامع دماغ سے کام لینے لگا - اس کی بعض ناولوں میں سے محکمہ احتساب نے کچھ حصے حذف کردیے تھے' اب وہ بھی دوبارہ اضافہ کے ساتھ شائع ہوئیں —

اس کی ابتدائی ناولیں ”نومیدہ“ (مایوس) اور (ایک مردہ شخص کی بیاض) پر جوش عشقیہ افسانے تھے' اور اس میں وہ جذباتی رنگ جو جنگ جو ترکوں کا خاصہ ہے' کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا - ”فردی و شرکاء“ میں ایک نئے قسم کا قصہ لکھا گیا ہے' یعنی حب زر کا - اس میں عشق اور حب زر میں زبردست کشمکش ہوتی ہے اور آخر کو حب زر کو شکست ہوتی ہے - اس افسانہ میں مصنف نے بہت زیادہ آورد سے کام لے کر اپنی انشا پردازی کا کمال دکھانے کی کوشش کی ہے' لیکن بھونڈا پن آگیا ہے - برخلاف اس کے' اس کی ناول ”مائی وسیاہ“

میں اس کا شاعرانہ کمال اصلی رنگ میں ظاہر ہوتا ہے، اس میں اس نے اپنی توجہ کو زندگی کے محض جذباتی پہلوؤں سے ہٹا کر، اسے حقائق کی طرف مبذول کردیا ہے، مثلاً شادی کے مسائل، مزدور پیشہ طبقہ کی مشکلات اور قسطنطنیہ کے بو قلموں ماحول اور اس کی خفیہ ادبی انجمنوں میں ایک مصنف کی شہرت کے لئے جد و جہد —

اس ناول کا ہیرو (بطل) ایک غریب شاعر ہے جس پر اپنی ماں اور بہن کی پرورش کا بھی بار ہے اور گزر اوقات کے لئے بہت زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے۔ اس شاعر کی تین آرزوئیں ہیں - دولت پیدا کرنا، مشہور شاعر بننا اور اپنی محبوبہ سے شادی کرنا - اسے ان تینوں آرزوں کے پورے ہونے کی امید ہے، اور اسے یقین ہے کہ اس پر "باران در و الماس" ضرور ہوگا - کتاب کے عنوان " مائی و سیاہ" کا پہلا لفظ گویا اسی کی طرف اشارہ کرتا ہے - لیکن زندگی میں باران در و الماس کہاں ؟ - اس کی بہن کی شادی ایک کمینہ ناتراش سے ہوتی ہے، جو اس پر طرح طرح کے مظالم کرتا ہے - اس کی محبوبہ اس کو چھوڑ کر ایک افسر سے شادی کرلیتی ہے، اور اس مایوسی میں وہ (شاعر) اپنے اس مسودہ کو جس سے اسے ادبی شہرت حاصل کرنے کی امید تھی، تلف کردیتا ہے - یہاں سے تصویر کا منظر نیلگوں افق کی بجائے شب تیرہ و تار ہوجاتا ہے - ہر اعلیٰ درجہ کی ادبی کتاب کی طرح، "سائی و سیاہ" میں بھی ہمیں اظہار جذبات و یاس و حرمان کے ساتھ ساتھ اصلی اور حقیقی زندگی کے چربے نظر آتے ہیں - اس کتاب کے دوسرے ضمنی افراد کی سیرتیں پرزور قلم سے اور عین فطرت کے مطابق لکھی گئیں ہیں، لیکن خود ہیرو کی سیرت، جسے مصنف خاص طور پر پر زور بنا کر پیش کرنا چاہتا تھا اتنی مصنوعی ہو گئی ہے کہ حقیقت سے اس کا کوئی لگاؤ ہی باقی نہیں رہا - مصنف کو فرانسیسی ادبیات کی جو واقفیت تھی، اس

سے اس نے ھیرو کو متصف کر دیا ھے ' جو ایک دھاتی مدرسہ کا پڑھا ھوا اور تجربات زندگی سے بالکل کورا ھے - " عشق ممنوع " میں ایک لڑکی کی پر جوش محبت کا قصہ بیان کیا گیا ھے ' اس کی شادی ایک معمر دوات مند سے ھوتی ھے ' جس کی دو لڑکیاں پہلے سے موجود ھیں - یہ دونوں لڑکیاں اپنی سوتیلی ماں کی طرف سے رقابت رکھتی ھیں ' انجام یہ ھوتا ھے کہ سوتیلی ماں کو آخر کو شرمندگی اٹھانی پڑتی ھے اور وہ خود کشی کر لیتی ھے —

اگرچہ اس ناول کی تصنیف کو پینتیس سال ھوچکے ھیں ' لیکن اس کی تمام دلکش خصوصیات آج تک تازہ ھیں - قصہ شروع سے آخر تک جاندار ' دلچسپ اور حقیقی ھے ' البتہ نفس قصہ میں کسی قدر الجھن پائی جاتی ھے - ایسا معلوم ھوتا ھے کہ مصنف کو حقیقی زندگی پیش کرنے ' اور جسم و روح انسانی کے جذبات کو بے نقاب کرنے کی آرزو تو تھی ' لیکن بعد کو حقیقت نگاری کے میدان میں قدم رکھنے سے وہ خود جھجکنے لگا ' اور اپنے ابطال (ھیروز) کی پردہ پوشی کے لئے اس نے ان کی کوتاھیوں پر رائے زنی شروع کردی - ایک اور چیز قابل لحاظ یہ ھے کہ خالد ضیا کی اِن ناولوں میں ' —— مثلاً شکستہ زندگیاں ' جس میں اس نے ایک ڈاکٹر کے مجنونانہ عشق کا ذکر کیا ھے ' جو اپنے خاندان والوں کی طرف سے غافل ھوکر دوسری ھی طرف عیش و عشرت میں مشغول ھو جاتا ھے جس کا نتیجہ یہ ھوتا ھے کہ اس کی خاندانی زندگی تباہ ھو جاتی ھے ' اس کی لڑکی بھی ھاتھہ سے جاتی رھتی ھے —— ھمیں وہ رقیت اور خیالی رومانیت نہیں نظر آتی جو پیری لوتی کی ناول Les Desenchantees (پریرویان ناکام) * میں ملتی ھے - خالد ضیا ترک تھا ' اور اس نے ترکی

---

* یہہ لوتی کے ناول کا ترکی ترجمہ ھے - ۱۲ - مترجم

زندگی کے خد و خال حقیقت نگاری کے موقلم سے اتارے ہیں ' جن کے رنگوں میں ہمیں باسفورس میں غروب آفتاب کا منظر نظر آتا ہے - لیکن مقتضاے زمانہ اور ۱۸ ویں صدی کے آخر میں قسطنطنیہ کی جو عام فضا تھی ' اس کا اثر اس پر بھی نظر آتا ہے ' مثلاً اس کی ناولوں کے ہیرو اور ہیروئن سب یورپی ادب اور فن کی اعلی واقفیت رکھتے ہیں - حالانکہ اصل میں یہ واقفیت خود مصنف کو حاصل تھی ' جسے اس نے غلطی سے اپنے قصوں کے افراد سے بھی منسوب کر دیا ہے ' لیکن اس کا قصہ لکھنے کا ڈھب ایسا پسندیدہ ہے جس سے بہتر شاید ہی نظر آسکے - خالدضیا سے ترکی افسانہ نگاری کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے - اس نے جو بیج بویا تھا ' وہ آخر میں چل کر بہت بار آور ثابت ہوا ' اور اپنے ابناے ملک کے دلوں پر جو نقوش وہ بٹھا گیا ہے وہ فنا نا پذیر ہیں —

اب ہمیں ترکی آسمان ادب پر ایک اور شہاب ثاقب نظر آتا ہے ' یعنی جناب شہاب الدین ' جو شاعر ' نثار ' اور مضمون نگار تھا - اگرچہ اس کا پیشہ طبابت تھا ' لیکن وہ فطرتاً اہل فن تھا ' اس نے فرانسیسی ادبیات پر جس پر اسے پورا عبور تھا ' کتابیں لکھیں ہیں - علی ہذا سفر حجاز کے متعلق بھی اس نے ایک سلسلہ مضامین لکھا ہے ' یعنی " حج یولندہ " اور " یورپ مکتبلری " شاعری میں وہ شستہ اور شائستہ عاشقانہ مذاق رکھتا ہے ' اس نے اپنی شاعرانہ خصوصیات کو ذیل کے اشعار میں بیان کیا ہے —

وجود فکرمہ بر شہپر ملک یا پسم
شب الفاظ و نور خولیا دن
بر فکر ملہ حوض رو یا دن
آلوپ کو پوکلری دو قہجہ بر چیچک یا پسم

بذم بوتنن اصلم بویدی شعرہ با شلا رکن
(میں نے اپنے شبدیز خیال میں فرشتہ کے پر لگا دئیے ھیں
شب الفاظ و نور تخیلات سے
اپنے مذاق کے مطابق ایک پھول لگانے کے لئے
خوابوں کے حوض کے کف سے
یہ ھے میرا مدعا شعر گوئی سے —)

برت پر اس نے جو نظم لکھی ھے اس کی موسیقیت اس وقت تک سحر آفرینی کرتی رھے گی جب تک کہ موسیقیت کا لطف لینے والا سامعہ باقی ھے —

اشقی غیب ایلین بر قوش کمی قار
کنچن ایام نو بہاری آرار
اے قلوبک سرود شیداسی اے کبوتر لرک نشیدہ لری
نو بھارک او الیشتہ فرداسی قاپلادیں بردریں سکوتہ یری
کہ خموشانہ دو شر، دو شر آغلار
(اس پرندے کی طرح سے جس کا جوڑا کھو گیا ھو، برت
ایام نو بہار کو تلاش کر رھی ھے
آہ، وارفتہ دلوں کا شیدا یانہ نغمہ
آہ، زمزمہ سنج مغنیوں کا نشید
فردائے بہار کی یاد میں
وہ دنیا کو ایک حلقہ سکوت میں لے لیتی ھے
اس کے لکہ آھستہ آھستہ نیچے کی طرف
گہرے درد والم کے ساتھ گرتے ھیں)

اپنے عشقیہ اشعار میں وہ اپنے عشق کا اظہار اور محبوبہ کی پرستاری لطیف ترین الفاظ میں کرتا ہے' اور اسے اپنے الفاظ کو ایک ایسی موسیقیت کا جامہ پہنانے کی قدرت ہے' جس سے ایک ترنم خیز چشمہ کے اوپر قوس قزح کے نکلنے کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے - " ثروت فنون " کے صفحات میں اس کے اشعار بہ کثرت نکلے ہیں —

صوفیوں کی طرح ' اس کی نظر میں' دنیا میں اگر کچھ ہے تو عشق ہے : —

بوجیابان وزن و قافیہ دن کچیرن فکر می خیالکدر
کو کلمی رقص شعرہ دعوت ایدن موسیقی لب و مقالکدر

(وزن اور قافیہ کے اس بیان میں
تیری تصویر ہی میرے خیال کو سیدھا رستہ دکھاتی ہے
جو چیز میرے دل کو رقص شعر پر ابھارتی ہے
وہ تیرے لب و گفتار کی موسیقی ہے)

اس کا یہ مجازی عشق کبھی کبھی بلند ہو کر اس سطح پر پہنچ جاتا ہے جہاں عشق حقیقی کی روحانی پیاس کی تسکین ہو جاتی ہے - تان جوان پر (جو عیش پرستی اور عشق حقیقی دونوں رکھتا ہے) جو نظم اس نے لکھی ہے' وہ معمولی انسانوں' اور خواب غفلت سے چونکے ہوے مشککین دونوں پر صادق آتی ہے - مسرت ' الم دنیا کی کھکھیڑیں ' جرائم غرض ہر پہلو سے وہ محبت ہی کا جویا ہے - اسے مسرت سر مدی کی جستجو ہے' لیکن انجام میں اسے اکثر " صنف نازک " ہی ملتی ہے —

جناب شہاب‌الدین کے کلام میں جس عشق کو بیان کیا گیا ہے' وہ اس خالی ہاے واے سے بالکل مختلف ہے ' جیسے دوسرے شعرا پامال استعاروں

اور تشبیہوں میں بیان کیا کرتے ہیں - اگر چہ ان کے اشعار ترکی زبان ھی میں ھیں ، اور ان میں فارسی الفاظ کا استعمال بھی کیا گیا ھے لیکن ان میں ، اور ، باقی ،، ، نفی ، اور ، وھبی ، کے اشعار میں کوئی نسبت ھی نہیں ھے —

انھوں نے یورپ کی روح کو جذب کرکے اسے اپنے الفاظ میں پوش کیا ھے لکھتے ھیں —

پک پوش در او حس لکن او بو غلق صلولار دل
آفاق حیاتیہ دہ کی جوفی او اور تر
ھر کس ھپ او بو شلقدہ آرار بر طوتہ جق یر
پیر امن ھمرندہ کی کردا بہ مقابل

(یہ حس خود خالی ھے ، لیکن دل اس سے بھرا ھوا ھے
افق حیات کا خلاء اسی سے پر ھے
ھم سب اس خلا میں ایک جاے قیام کی تلاش کرتے ھیں
تا کہ زندگی کے گرداب سے بچ کر اس میں پناہ لیں)

مرغ عشقک بتون ترانہ اری افق رو حمدہ اھتزاز ایتدی
ھر بری آیری بر بہار اثری کیبی بر موسم اکلفوب کیتدی
(مرغ عشق کے زمزمے جو میرے افق دل میں اھتزاز پیدا کرتے ھیں
ان میں سے ھر ایک اثر بہار ھے ذرا دیر کھلا ، اور غائب ھوگیا)

ھر ھمت ایچندہ حبس ایدرک انفعالمی روحم ایدر بوکتم ایلہ تعدیل انکسار
آنجق طویار شھیق تحسر مالمی بر مند یلک ایچندہ قالان عطر یادگار

(میرے درد پر دردوں کا طومار ھے —
میں اپنی روح میں اس کے نیش کو چھپا لینے کی کوشش کرتا ھوں
میری حسرت کی سانسیں صرف اس خوشبو کو سونگھتی ھیں جو اس

عطر رخصت * سے نکلتی ہے جو رومال میں لگا ہوا ہے —

نثر نگاری میں شہاب‌الدین کا پایہ شاعری سے کہیں زیادہ بلند ہے - اور ان کی تصانیف کو اول درجہ کی انگریزی یا فرانسیسی تصانیف کے مقابلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے - سیاحت و سفر کے متعلق جو مقالات انھوں نے لکھے ہیں ان میں مختلف ممالک کا بیان اس طرح کیا گیا ہے کہ ان کی جیتی جاگتی تصویر لفظوں میں اتر آئی ہے ' اور اس سے ان کی قوت مشاہدہ اور قوت بیان کا ثبوت ملتا ہے - ان کی نثر کو پڑھنے کے بعد حیرت ہوتی ہے کہ ترکی زبان کی صفائی کے مدعی تھیٹ روز مرہ لکھ کر طرز عبارت کو اس کے ذخیرۂ لفظی سے محروم کرنے کی کوشش آخر کیوں کرتے ہیں —

دستوری حکومت کے قیام نے ادبیات میں ایک نئی تحریک پیدا کی - چونتیس سال کی امید و بیم کی حالت کے بعد جو دھڑکتے ہوے دل کے ساتھ بسر کئے گئے تھے ' یکایک مسرت و شادمانی کے غلغلے بلند ہوے اور ترکی دنیاے صحافت نے آزاد ہو کر سانس لی اور اس میں لا محدود جوش اور سر گرمی پیدا ہو گئی - سینکڑوں کتابیں تصنیف ہوئیں اور لوگوں نے انھیں کمال شوق کے ساتھ پڑھا - یہ ایک پوری قوم کی سچی اور اعلی درجہ کی مسرت کا نظارہ تھا ' اور جن لوگوں نے ہمدردی کے ساتھ ترکی کے حالات و واقعات کا مطالعہ کیا تھا ' وہ بھی اب ترکی کے نئے اور شاندار مستقبل کو دیکھ کر پھولے نہ سماتے تھے - محکمہ احتساب نے جن مصنفوں کی زبان بندی کر دی تھی ' اب وہ پھر میدان میں آگئے '

---

* عطر رخصت - وہ عطر جو رخصت ہوتے وقت مہمانوں کے رومالوں یا لباس میں مل جاتا ہے — مترجم - ۱۲ -

اور ترکوں کی روح میں ایک نئے قسم کی لرزش اور تحریک پیدا ہوگئی۔ ان نو جوان مصنفین میں افسانہ نگار، تاریخ اور معاشرت کی چھان بین کرنے والے فلسفی، اور خواب شیریں دیکھنے والے شعرا، جو جوش میں آ آ کر عشق و محبت کی داستانیں سناتے تھے، سبھی شامل تھے۔ وطن پرستی اور جوش کی اس نشاۃ ثانیہ میں صرف ایک رجحان کار فرما نظر آتا تھا، اور وہ یہ کہ قدیم چیزوں سے دامن چھڑا کر اس نئے نور کو جذب کیا جاے جو یورپ سے چھن چھن کر آ رہا تھا۔ قومیت اور ترکی شہنشاہیت ان دونوں جذبات نے مل کر ایک نئی معاشرت کی آرزو کی شکل اختیار کرلی۔ حیات اجتماعی کی پرانی شکلیں رفتہ رفتہ مٹنے لگیں۔ پڑھے لکھوں کے دلوں سے بھی پرانے مدرسہ کی تعلیم کا شوق محو ہو گیا اور اعلیٰ طبقوں کے اندر فرانسیسی تہذیب سرایت کرگئی۔ السنہ عربی و فارسی، اور فلسفہ مشرق کی تحصیل کے شوق نے کانت کے فلسفہ کے لئے جگہ خالی کردی، اور صفائی زبان کی تحریک کی وجہ سے عربی و فارسی لغات کی جگہ ترکی محاورات و الفاظ نے لے لی۔ اس رجحان کی دو حیثیتیں تھیں۔ یعنی تمدن کے لئے مغرب کو، اور تہذیب و شائستگی کے لئے مشرق کو سر چشمہ ہدایت قرار دیا گیا تھا، لیکن آثار بتا رہے تھے کہ یہ مشرق، اسلامی تہذیب و شائستگی کا مشرق نہ ہوگا۔ قومیت نے مذہب کے علاوہ ایک اور نصب العین بھی پیدا کردیا تھا، اور اب ترکوں کو اپنی قدیم تاریخ اور اسلام سے پہلے کی داستانوں سے خوشی اور ان پر فخر ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ مذہبی احساس اور اسلامی اخوت کے بدلے نسلی تاثرات پیدا ہوتے گئے۔ نامق کمال اور عبدالحق حامد کا " وطن " تو " دارالاسلام " تھا، لیکن اب قومیت کی نئی تحریک نے دوسروں کے مقابلہ میں صرف ترکی نسل کو

اپنا مطمح نظر بنا لیا - یورپ کے نسلی اور قومی تصورات ترکی نوجوانوں کے دماغوں پر بھی غالب ہوگئے اور کاھوں " Cahun " کی تصنیف Introduction to the History of Central Asia (مقدمہ تاریخ ایشیاے وسطی) نے ان میں اپنی قدیم تاریخ پر فخر کرنے کا شوق پیدا کر دیا - اب ترکی رسالوں اور مجلوں میں قدیم عقائد و خیالات پر آزادی کے ساتھہ تنقیدیں اور نکتہ چینیاں ہونے لگیں - افسانوں میں افراد قصہ کی نفسي تحلیل نے اب مصنفین اور قارئین دونوں میں یہ شوق پیدا کر دیا کہ یہ دیکھیں کہ معاشرتی اور تاریخی واقعات کے پس پردہ کیا ھے - اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ترکی کی یہ کا یا پلٹ کسي قدر اچانک ضرور تھی ' اور مغربی سائنس کے انکشافات نے ان کے دلوں میں طفلانہ مسرت پیدا کر دی تھی - لیکن شروع میں خود یورپی لوگوں کا بھی یہی حال تھا ' ھمیشہ اور ھر جگہ عمل کے بعد رد عمل ہوتا ھے اور رفتہ رفتہ خیرالامور اوسطہا کي شکل پیدا ہوتی ھے - اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ یورپی تہذیب اختیار کرکے اسے اپنی تہذیب کے موافق بنانے میں ترک ھی تمام دوسرے مسلمانوں کے مقابلہ میں پیش پیش تھے - اب قدیم اور جدید کا معرکہ شروع ہوگیا - ایک طرف ترکی ناول نویس مغرب کی ٹکر کی ناولیں تصنیف کر رھے تھے ' تو دوسری طرف اھل مدرسہ اب تک " تقلید " کے قائل اور بے نتیجہ موشگافیوں میں مصروف تھے - اس معرکہ کا انجام بدیہی تھا - دور ظلم و تعدی کے ختم ہوتے ھی ایک نئی روحانی اور باطنی زندگی جنم لے چکی تھی —

محمد رؤف نے اپنا دل آویز افسانہ ایلول (ستمبر) تصنیف کیا - یہ ایک بغایت دل کش داستان حسن و عشق ھے جس کا منظر ساحل باسفورس

کے سرو کے درخت ہیں - اس افسانہ نگار کو لطیف سے لطیف جذبات اور قلب انسانی کے پوشیدہ سے پوشیدہ واردات بیان کرنے میں خاص کمال حاصل تھا - اسی کا دوست ' حسین جاہد اسم با مسمی یعنی دراصل مجاہد تھا - وہ تقلید اور اس کی جمود آفرینی پر دلیری کے ساتھہ تنقیدیں کرتا ' اور خیالات و افکار کی ترقی اور تجدید کا حامی تھا - اسی کی تحریروں کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشروطہ کے اعلان سے ایک روز قبل اخبار " ثروت فنون " نکلنا بند ہوگیا - وہ افسانہ نگار ' مختصر قصے لکھنے والا ' اور نقاد تھا - اس کے بہترین افسانے یہ ہیں : " خیال " اور " کیوے دیوے نوے " (دیہاتی شادی) - ان دونوں میں حقیقت نگاری کا رنگ پایا جاتا ہے ' لیکن اس کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس نے لسانیاتی مباحث پر تنقیدی نظر ڈالی اور فنون لطیفہ کے متعلق یورپی افکار و تصورات کی معلومات لوگوں میں پھیلائی - جب ترکوں کو ازسر نو سیاسی آزادیاں حاصل ہوگئیں ' تو اس نے بھی اپنی تمام‌تر توجہ صرف اخبار نکالنے ہی پر مبذول اور اسی کی حد تک محدود کردی ' اور در حقیقت اس کی پر جوش طبیعت اس کام کے لئے موزوں بھی بہت تھی —

جادہ زندگی کا اکیلا مسافر ' سلیمان نزیف ' اپنے سیاہ چہرے اور سفید چمکدار دانتوں کی طرح ' ترکی ادبیات میں بھی دو رخی حیثیت رکھتا ہے - وہ کبھی تو جری اور بہادر نظر آتا ہے ' اور کبھی منکسرالمزاج اور خوشامدی ' اور اس کی سیرت کی یہ دو رنگی اس کی تصانیف میں بھی جھلکتی ہے - وہ ترکی زبان کی لطافتوں اور باریکیوں پر بہت کچھہ عبور رکھتا تھا ' اور اس کی وجہ سے اسے مشہور ترین مصنفوں کے زمرے میں جگہ ملنی چاہئے تھی ' لیکن اس کی طبیعت کی لٹک نے اسے ہمیشہ انتہا پسند بنائے رکھا - اس کی نثر کا پایہ ' بمقابلہ شاعری کے ' کہیں

زیادہ بلند ہے —

احمد حکمت کی تصانیف سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب ترکی نثر پر توران خواہی اور ترکی نسل پرستی کے رجحانات غالب ہوتے جا رہے ہیں۔ احمد حکمت نے اس رجحان کی روز افزوں قوت کا اندازہ لگا لیا تھا اور اپنے افسانوں کے ذریعہ اس نے اسے اور تقویت دی۔ اس کی کتاب "خارستان و گلستان" ایک رومانی داستان حسن و عشق ہے۔ اس کے مطالعہ سے فطری رجحانات قوی تر ہو جاتے ہیں، وہ گویا ترکوں کے کان میں یہ بات ڈالتی ہے کہ اپنی نسل سے محبت کرو، اپنے آپ پر فخر کرو —

ایک طرف تو رومان نگار ترکی نسل کے دلوں میں شعور ذات اور خود شناسی کے احساسات بیدار کر رہے تھے، تو دوسری طرف، حسین سیرت، اور اسی کے رنگ کے دوسرے شعرا، زندگی کی تنہائی، اور فراق یار کا ماتم کر رہے تھے، یہ موضوعات اس میں شک نہیں کہ نہایت فرسودہ اور پا مال ہیں، لیکن جب انسان کے سینہ میں دھڑکتا ہوا دل موجود ہے، اس وقت تک ان میں بھی تازگی باقی رہے گی حسین سیرت کی زبان اس لازوال اور فناناپذیر غم والم کو نئے سروں میں ادا کرتی تھی۔ اس میں میں ترنم اور خلوص تھا، الفاظ کے اندر جو اصلی جذبات مضمر ہیں انہیں چھپانے یا مبالغہ کے ساتھ پیش کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی —

کونش باتار طاغیلیر افقہ ہپ تخیل شام

اوز اقدہ بر اوداہن چنغراق صداسی کلیر

آقین آقین سوررولر ہپسی عودت الیدہ در

قویو نلری طاغیلان بر چوبان کبی طالغین

نه بکلرم یولک اوستنده بویله هر آقشام

آرار سیسک بنی بیلمم خجسته یا وردم سن

سلمک خیال یتیمسکله اغلا یورکن بن

سورج نیچا هوتا جاتا هے - دهوپ آسمان پر پهیلی هوی هے - شام کے تخیلات پیدا هو رهے هیں

دور سے کسی چرا گاه میں گهنٹیوں کے بجنے کی صدا سنائی دیتی هے

بهیڑوں کے گلے آهسته آهسته واپس آ رهے هیں

اس گڈریئے کی طرح ، جس کی بهیڑیں بهٹک گئی هوں ، خیال میں ڈوبا هوا

[میں هر مرتبه سڑک پر کس چیز کا انتظار کرتا هوں

اے خجسته بچے ، کیا تو مجهے ڈهونڈتا پهرتا هے ؟

اور ادهر میں تیرے یتیم خیال کے لئے آنسو بها رها هوں]

او کوزلر بکا توجیه ایتمیجک او دور اقلر بنی سیرت دییه یاد ایتمیجک

آیریلان اللرمز بردها بر لشمیجک آرا مزدن آجی برباد خزاں اسدی بوکون

اے نها لنده دو کولمش داغیلان نازلی چیچک

[آه ، اب وه آنکهیں مجهے نه دیکهیں گی

وه لب اب مجهے نه پکاریں گے -

همارے هاتهه جو الگ هوگئے ، اب دو باره نه ملیں گے

یه کیسی غم انگیز آندهی هم دونوں کو جدا کرگئی

آه ، حسین غنچه نا شگفته جو خاک میں مل گیا]

سلیمان نزیف کا چهوٹا بهائی ، فائق علی ان زبردست نا کامیوں اور محرومیوں کا ایک بهادر ، لیکن غمگین شاعر تها جو ترکی قوم کو اٹهانا پڑی تهیں - زمانے کے آهنی پنجه نے ان کی بڑی بڑی آرزوں کا گلا گهونٹ دیا

تھا - نئی آزادی اور مسرت کی زندگی پر وہ دل کھول کر خوشیاں بھی نہ منانے پائے تھے کہ حریص یورپ کے دغا بازانہ حملوں نے ان کی خوشیوں کو ملیامیٹ کر دیا - جنگ طرابلس اور ریاست ہاے بلقان کی منحوس فوج کشی نے رعایا کی آرزوں کے غنچہ نا شگفتہ کو پامال کر دیا - اس قدر جان بازی اور بہادری سے لڑنے کہ باوجود شکست اور مایوسی کا منہ دیکھنا یہ ترکی قوم کے لئے ابتلاے عظیم تھا - فائق علی نے اپنی نظموں میں اسی منحوس زمانے کی رام کہانی بیان کی ہے - اس کے کلیات کا عنوان " فانی تسلی لر " (فانی امیدیں) ہے ' اور اس ایک قابل قدر ضمیمہ " الحان وطن " ہے —

جو حلقے پہلے محض اپنی جنگ جوئی کہ لئے ممتاز تھے ' ترکی کے ابتلاء کی وجہ سے ان میں بھی شاعرانہ روح جوش زن ہوگئی - جنگ روس میں ' سلیمان پاشا ترکوں کا ایک مشہور افسر تھا - اس کا لڑکا سلیمان نسیب شاعر تھا ' اور فطرتاً نہایت ہمدرد اور حلیم الطبع - اس کی طبیعت نہایت صاف تھی اور اس کی نظموں میں ہمیں رحم اور نیکی کی شمیم جاں فزا ملتی ہے - " جلال ساحر " شاعر نسائیات اس کا جواب تھا - معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک رنگین مزاج تتلی ہے اور پھول پھول اڑنا اور زندگی کے گلستان سے شبنم اور شہد حاصل کرنا ' یہ اس کا کام ہے - فرانسیسی شاعر بادی لے یر (Baudelair) کی معری نظموں کو پڑھ کر اس کے دل میں بھی نئے جذبات پیدا ہوے ' چنانچہ اس نے نہایت حسن و خوبی کہ ساتھ اپنی نظموں میں اسی کا رنگ اتارا ہے —

قادینلر اوطاسہ او کسوز قالیردی اشعارم

قادین بوسہسلی حیاتک یگانہ یلیدیر یدر

(اگر جنس لطیف نہ پیدا ہوئی ہوتی ' تو میرے اشعار یتیم ہی رہتے عورت ہی اس زندگی کے ابر آلود مطلع کا در فشاں ستارہ ہے)

اب ہم اپنی توجہ ایک ایسے شاعر کی طرف مبذول کرتے ہیں ' جسے آج کوئی جانتا بھی نہیں ' اور جس نے بورژے (Bourget) یا فلابرت (Flaubert) کے نقش قدم کو اپنا دلیل راہ نہیں بنایا ' یعنی حسین رحمی - اس نے اپنے افسانوں کے لئے اعلیٰ طبقہ کے افراد کا نہیں ' بلکہ شہر کی گلی کوچوں اور چوراہوں کے لوگوں کا انتخاب کیا - ہمارے لئے ' بمقابلہ دیگر شعرا کے ' وہ اس وجہ سے زیادہ قابل قدر ہے کہ اس نے اپنے قصوں میں ان لوگوں کو زندہ جاوید بنایا ' جو مشرق کی اس خاص رنگینی کے نمائندے تھے ' جو آج کل روز بروز مٹتی جارہی ہے - اس کے افراد قصہ اپنی خاص زبان بولتے ہیں جو اس میں شک نہیں کہ کرخت اور درشت ہے ' لیکن سچی بھی ہے - اسے ترکی کا ایمیلی زولا (Emile Zola) کہا جاسکتا ہے - اس نے اپنی زندگی ان تنگ گلیوں میں بسر کی تھی ' اور دونوں وقت کا کھانا ان آش خانوں میں کھایا تھا جہاں حمال ' لڑاکا بڑھیا عورتیں ' مدرسہ کا شرمیلا طالب علم اہل حرفہ اور ان کے ساتھی اپنی حقیر ' لیکن رنگین زندگی بسر کرتے تھے - اس کی تصانیف مستریس (مالکہ) " مربیہ " (اتالیقہ) " سون آرزو " (آخری آرزو) وغیرہ ہیں ' وہ بہت پر نویس اور تیز نویس تھا - اور چاہے اس کا طرز تحریر اعلیٰ درجہ کا نہ ہو ' تاہم اس کے قصہ کے افراد ہمیشہ اور ہر وقت دلچسپ ثابت ہوں گے —

احمد وسیم جامعیت کے اعتبار سے رحمی ہی کے برابر تھا - اس نے ہر ترکی اخبار میں ' اور ہر موضوع پر مضامین لکھے ہیں - نظم و نثر ' تاریخ افسانہ ' قدیم روائتیں ' رسم و رواج کا بیان ' غرض کہ ہر ممکنہ مبحث پر

اس نے قلم اٹھایا ہے ۔ وہ اس شہر قسطنطنیہ کی آخری یاد گار ہے جو اپنی تاریکیوں کے با وجود روشن تھا ' پر اسرار اور قابل محبت ' شرمیلا اور عیاش غرض کہ رومان اور حقیقت دونوں کا شہر تھا اور جو جدت پسندی کی رو میں آکر ' ہماری آنکھوں کے سامنے کچھ کا کچھ ہوگیا ہے ' اور اس کی پرانی رنگینیاں اب محض افسانہ بن کر رہ گئی ہیں —

ترکی شاعری میں توران خواہی کی آرزو کی نمائندگی محمد امین نے کی اور وہی پہلا شاعر ہے جس نے کوچہ و برزن کی زبان میں اشعار لکھے ۔ اس نے چھوٹی چھوٹی وطنی نظمیں لکھی ہیں جن میں وہ بڑے فخر کے ساتھ اپنے آپ کو ترک کہتا ہے ۔ واضح ہو کہ پہلے لفظ ترک وحشی اور غیر متمدن کا مرادف تھا ' اور کوئی شخص اپنے لئے ترک کا استعمال پسند نہ کرتا تھا —

بن بر تو رکم دینم جنسم اعلو در

(میں ترک ہوں ' میرا دین اور میری نسل اعلی ہے)

یہ اشعار آئندہ کے لئے ایک فال اور نئے نصب العین کا پیش خیمہ تھے ۔ اس کے اشعار عملی باتوں کے متعلق ہوتے تھے ۔ وہ کاشتکار کو ابھارتا تھا کہ اور زیادہ غلہ پیدا کر ' اور اپنی زمین سے محبت کر ' جو مسرت اور فیاضی کی ان داتا ہے ۔ اپنی نظم " جنگ گیدر کن " (میدان جنگ کی طرف روانگی) میں اس نے ترکی سپاہی کی عظمت بیان کی ہے ۔ اس کی نئی نظموں میں ' جن میں اس نے عربی ' لفظ " الله " کی جگہ قدیم ترکی لفظ " تنری " یعنی " خدائے ترک " استعمال کیا ہے ' ترکی قارئین کے مقابلہ میں یورپی علماء نے زیادہ دلچسپی لی ہے ' اور ترکی جمہور نے بھی خواہ وہ اس کی بے جوڑ نظم کو نا پسند کرتے ہوں ' اس کے جذبات کے

ساتھہ ھمدردی کی ھے - اس پر تنقیدیں بھی ھوئیں ' لیکن وہ ان کو برداشت کرلے گیا اور تھوڑے ھی دنوں میں ضیا گیوک الپ ' تیکن الپ اور دوسرے شعرا کی توران خواھی نے ثابت کر دیا کہ اس کی بدعت ' بدعت حسنہ تھی —

اسی زمانے میں بعض فرانسیسی مصنفین مثلاً باودی لیر اور ورلائن کے رنگ کا اثر بعض نوجوان مصنفین مثلاً امین بلند ' شہاب الدین سلیمان اور تحسین ناھید پر یہاں تک پڑا کہ انھوں نے فجر آتی (صبح طالع) کے نام سے اپنی ایک الگ انجمن قائم کرلی ' اور قافیہ حتیٰ کہ بعض اوقات اوزان تک کی قیود سے دست بردار ھوکر محض ترنم الفاظ کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگے - یہ لوگ فرانسیسی پارنسی (Parnassian) مصنفین کے متبع تھے ' جو ادب میں نئے نئے اشکال اور نئے نئے طرز ادا ایجاد کر کے اپنی جدت پسندی کا ثبوت دیا کرتے تھے - اس گروہ کا سب سے مشہور نمائندہ احمد ھاشم تھا ' جس کا اصول یہ تھا کہ :—

> " شاعری کسی بندھے ھوے معنے کی مظہر نہیں ھے - رات کے وقت جب آگ لگے ' تو وہ آسمان والوں کو نظر آسکتی ھے ' لیکن گڑھوں میں پڑے ھوے لوگوں کو نظر نہیں آتی - بہترین نظم اپنی تحریکی قوت پڑھنے والے کے تخیل سے حاصل کرتی ھے یہ کچھہ ضروری نہیں کہ نظم میں صفائی اور سلاست ھی ھو ' اس لئے کہ ان چیزوں کے موجود ھونے سے تخیل خالی رہ جاتا ھے - انبیاء اور پیغمبروں کے الفاظ کی طرح ' شاعری کو ایک سے زیادہ تعبیروں کا متحمل ھونا چاھئے " —

" فجر آتی " اس زمانے کے حالات اور واقعات کی پیدا وار تھی ' اس کے لوا بردار زیادہ تر اھل صحافت تھے ' لیکن اس کے نشو و نما کا نہم

دوسرا ہی تھا —

کسی قوم کی تاریخ کا تعین اور اس کی تشکیل محض اس کے جغرافی محل وقوع اور معاشی نظام سے نہیں ہوا کرتی - ایسے خیالات ' جن کی اصل تو خارجی ہوتی ہے ' لیکن جن کی قلم قومی دماغوں پر لگائی جاتی ہے ' اور پھر وہ دوسرے خیالات و جذبات جو ان پر مبنی اور ان سے پیدا ہوتے ہیں - یہ تاریخ کے زبردست ترین عوامل اور محرکات ہوا کرتے ہیں - جذبات کے تلاطم سے اس میں شک نہیں کہ خیالات و افعال انھی نالوں اور نہروں میں بہتے ہیں جو مادی حالات زندگی نے پہلے سے تیار کردی ہیں ' لیکن کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ خود ان نہروں اور نالوں کو بھی اپنی رو میں بہا لے جاتے ہیں - نوجوان ترکوں کی آرزوؤں اور امنگوں کے تین خاص رخ تھے ' عثمانی نصب العین ; اسلامی نصب‌العین ' اور " ہمہ ترکیت " * یا تو رانی نصب‌العین ' لیکن مادی حقائق و واقعات نے ان تینوں کو دبا دیا اور پورا نہ ہونے دیا - جنگ بلقان ' جس میں مسیحی دول کی طرف سے برابر قومی رجحان اور قومیت پسندی کا اظہار ہوتا تھا ' ترکی قوم خواہی کا ایک قدرتی جواب تھا - اس جنگ میں اسلام خواہی کے جذبات کی بھی کئی اعلیٰ درجہ کی مثالیں دیکھنے میں آئیں - ہندوستان سے بھی روپیہ اور دیگر ضروریات زندگی بکثرت ترکی بھیجی گئیں ' اور ہندی مسلمانوں کی ہمدردی ترکوں ہی کے ساتھ تھی - لیکن یہ ہمدردانہ مظاہرات ' آخر میں

---

* ہمہ ترکیت (Pan - Tur kis) یعنی ہر طرف ترکی ہی کا بول بالا ہو ' اور جملہ ادارات اور تشکیلات ترکی ہی ہوں —

۱۲ — مترجم

چل کر سادی نتائج و فوائد سے خالی ثابت ہوئے۔ جنگ بلقان کے بعد ہی جنگ عظیم ہوئی، لیکن زندگی اور موت کی اس کشمکش میں کسی نے ترکوں کی مدد نہیں کی، اور ہمہ اسلامیت، یا اسلام خواہی کی تحریک بھی سیاسی آلہ کی حیثیت سے ناکارہ ثابت ہوئی۔ جنگ بلقان نے سلطنت ترکی کا شیرازہ پراگندہ کردیا، جس کے وسیع اور مختلف الحالات صوبجات کے درمیان اگر کوئی وحدت تھی تو وہ صرف عثمانیت تھی، یعنی خانوادہ عثمان کا اثر، جو شیرازہ بندی کئے ہوئے تھا۔ زمانۂ قدیم میں ترکی سلطنت کا سنگ بنیاد عثمان کا خاندان ہی تھا اور یہ سلطنت صرف اس حد تک ترکی تھی کہ اس میں ترکی زبان بولی جاتی تھی، ورنہ در اصل یہ ایسی مختلف اقوم کا ایک معجون مرکب تھی جو ایک ہی سلطان کی مرضی اولی کی تابع تھیں —

خانوادہ عثمان کسی حیثیت سے بھی یورپ کے کسی شاہی خاندان سے نیچے درجہ کا نہ تھا۔ اس خاندان کی آخری یادگاروں میں بھی ہمیں قابل قابل افراد اور خواتین نظر آتی ہیں۔ ان میں سے اکثر نہایت باکمال صاحب فن تھے، خصوصاً فن عمارت اور موسیقی میں خاص کمال پیدا کیا تھا۔ جنگ عظیم نے اس آخری رشتہ اتحاد کو بھی توڑ دیا۔ ترکی کو شکست ہوئی۔ اور اسے پامال کیا گیا " دشمنان ترکی کے کیچڑ میں لت پت جوتوں نے " قسطنطنیہ کی مقدس عمارتوں کو ناپاک کیا۔ ترکی کی روح کو عدید سے شدید ابتلا کا سامنا کرنا پڑا۔ اسے اپنے ایک صدی پرانے نصب العین کی طرف سے بھی کوئی امید نہیں رہی، وہ سب خیالات محض خواب اور سراب ثابت ہوے، لیکن یہ نہ سمجھنا کہ ان حوادث نے روح ترکی کو فنا کردیا۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ ترکی کی روح نے اپنے اندر اب ایک نئے نصب العین کی تعمیر اور پرداخت شروع کردی، جس کو ماضی پر غالب آنا، اور ایک زیادہ

روشن مستقبل کی بنا ڈالنا تھا - یہ مستقبل ترکوں کا اپنا اور ان کے لئے حقیقی معنوں میں ترکی ہوگا ' اس لئے کہ اپنے ہم مذہب ہوں ' یا غیر مذہب رکھنے والے حلیف اور ساتھی ' سب ترکوں کو چھوڑ چکے ہیں - یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس نئی تحریک نے ماضی کی طرف سے بالکل ہی آنکھیں بند کرلی ہیں - انھوں نے صرف اس روداد ماضیہ کو خیر باد کہا ' جو ترکوں کی موجودہ سیاسی اور ذہنی زندگی سے کسی طرح میل ہی نہیں کھاتی ' اور اس کے بدلے اب وہ ماضی کی زیادہ حقیقی اور سچی تعبیر کرنے لگے ہیں ' یعنی خود ترکی قوم کی ماضی کی - اب تورانی خواہی ' ترکوں کا نصب‌العین بن گیا ہے - یعنی ان ترکوں کی زبان ' مذہبی خیالات اور اخوت جو زمانہ قدیم میں پراگندہ اور شکست خوردہ ہوکر ایک دوسرے سے الگ ہوگئے تھے - خون اور تہذیب کی یہ پرانی وحدت اور پرانا رشتہ اتحاد اب برملا ظاہر ہونا چاہئے ' اور اس نصب‌العین کو عملی طور پر حاصل بھی کرنا چاہئے - ضیا گیوک الپ نہایت بے باکی کے ساتھہ اسی جذبہ کو ظاہر کرتا ہے :-

وطن نہ تورکیہ در تور کلرہ نہ تورکستان
وطن بو یوک و سوبد بر اولکہ در توران

(ترک کا وطن نہ ترکی ہے نہ ترکستان
بلکہ یہ وطن ایک عظیم اور ابدی جگہ ہے یعنی توران)

اپنی تصنیف " ترک چواوک اساس لری " (اساس تورانیت) میں اس نے ان انتہا پسند توران خواہوں کے مقابلہ میں ایک زیادہ متین روش ختیار کی ہے ' جو تمام یورالی الطائی السنہ کے بولنے والوں کے سیاسی اور تمدنی اتحاد کا خواب دیکھتے ہیں - برخلاف اس کے ' ضیا گیوک الپ کا

تورانی خواہی کا تصور صرف معاشرتی اتحاد کی حد تک محدود ہے۔ اس کا یہ معاشرتی اتحاد " در خائیم " کے اصول پر ہے ' اور وہ اس اتحاد کو وسط ایشیا کے صرف انہی ترکی زبان بولنے والوں تک محدود رکھنا چاہتا ہے جو اپنے تمدن اور تہذیب کے اعتبار سے بھی ایک سیاسی وحدت بنا سکیں ---

اسلامی ترکی نصب‌العین کو چھوڑ کر ' ترکوں کا بتدریج تورانی نصب‌العین اختیار کرنا ' خالدہ ادیب خانم کی ناول ینی توران (توران جدید) میں بیان کیا گیا ہے ۔ یہ کتاب اپنے وطن خواہانہ جذبات کی وجہ سے بہت مقبول ہوئی ' اور اس کی وجہ سے اس کی مصنفہ کو بہت کچھ ادبی شہرت حاصل ہوئی ---

اس نئی روح کے خیر مقدم کے لئے ' نوجوان مصنفین کا ایک ادبی حلقہ " تورک یردو " کے نام سے قائم ہوا جس کے بانی مبانی عمر سیف‌الدین ' جو ظرافت کا خاص ملکہ رکھتے تھے ' اور ضیا گیوک الپ تھے ' اس ادبی حلقہ کی طرف سے ایک مجلہ بھی شایع ہوتا تھا ' جس کی زبان نہایت چبھتی ہوی اور پڑھنے کے قابل ہوتی تھی ' اور جس میں تورانی خواہی کی تحریک کار فرما نظر آتی تھی ۔ روسی ترک مثلاً اقچورہ اوغلو یوسف جو ایک نہایت موقر مقرر تھے ' اور آذر بائجانی ترک مثلاً آغا اوغلو احمد یہ دونوں بھی ' جو یوروپی روسی تہذیب کے رنگ میں رنگے ہوے تھے ' اس حلقہ میں شریک ہوگئے ۔ قدیم نصب‌العین ' پاکی زبان کو وسعت دیکر اب اسے " تحریک عود بہ ترکی قدیم " میں بدل دیا گیا تھا ' اور اب متروک الفاظ اور مقامی بول چال کے ایسے محاورات بھی جزو زبان ہونے لگے ' جو ایک معمولی قاری کی نظر میں کسی طرح بھی عربی اور فارسی کے غیر مانوس لغات سے کم دور از کار نہ تھے ۔ لیکن حقائق زندگی نے پھر نظریہ بازی پر فتح پائی '

اور رفتہ رفتہ اس شدت اور غلو کو مناسب اور قریب عقل حدود میں محدود کر دیا گیا —

رفتہ رفتہ اس نئی جد و جہد نے ادبی حلقہ سے نکل کر زیادہ وسعت اختیار کرلی ؛ اور اب معاشرتی حلقوں میں بھی اس کی کار فرمائی نظر آنے لگی - سب سے پہلے قسطنطنیہ میں اور پھر بعد کو صوبجاتی شہروں میں ایسے ادارات قائم کئے گئے ' جن کا مقصد نوجوان ترک مردوں اور عورتوں کو آئندہ قومی تشکیل کے قابل بنانا تھا - اس ادارہ کا نام ترک اوجاغی (ترکی گھر) ہے ' اور اس کے صدر حمداللہ صبحی میں جو ایک نہایت با مشقت شخص ہیں اور مصنف کی حیثیت بھی رکھتے ہیں ' اگر چہ ان کے بال ایک کہن سال اہل علم کی طرح سفید ہیں ' لیکن ان کے بشرے سے ہمیشہ نوجوانی کی شگفتگی ٹپکتی ہے - غالباً وہی خالدہ ادیب خانم کی ناول کے ہیرو ہیں ' یعنی ایک محنتی منظم ' اور اپنی قوم کی ترقی کے لئے آزاد خیالی کے حامی - ترک اوجاغی ایک تعلیمی کلب ہے ' جہاں شعراے قوم اپنا تازہ کلام سناتے ہیں ' سائنس داں اور علماء عالمانہ تقریریں اور مباحثے کرتے ہیں ' تفریحی اجتماع ہوتا ہے ' اور ایک زبردست کتب خانہ ہے جس سے ترکی سوسائٹی میں ترقی اور تجدید کی نئی روح پھونکی جاتی ہے - ہر ادارہ اپنی تاثیر میں کامیاب نظر آتا ہے اور میں نے اکثر شام کے جو اوقات ان اداروں کے جلسوں میں گزارے ہیں ' اور ان میں جو کچھہ دیکھا ہے ' اس سے مجھے یہ یقین ہوگیا ہے کہ ان عجیب و غریب ادارات کے اندر ایک نہایت زبردست تحریکی قوت کام کر رہی ہے ' جو ان کی زندگی اور ان کی قوت کی ضامن ہے - انھی حلقوں میں فن اور ادب کا نیا مذاق پیدا کیا جاتا ہے اور اس کا اثر دور دور کے قریوں تک پہنچتا ہے - بہترین نئی

ترکی ناولوں کی قدر جس جوش کے ساتھہ ان حلقوں میں کی جاتی ھے اس سے معلوم ھوتا ھے کہ ترکوں کی حیات روحانی کا مستقبل نہایت حوصلہ افزا ھے —

ترکی کے جدید ترین ادبیات پر راے زنی کرنا کسی قدر مشکل کام ھے ' اس لئے کہ ھم لوگ اس زمانے سے بہت قریب ھیں جس میں یہ کتابیں تصنیف ھوئیں ' اور ان کے مصنفین سے ذاتی طور پر واقف ھونا اور ان سے شناسائی رکھنا تنقیدی نظر کو تیز کرنے کی بجاے اسے کسی قدر دھندلا بنا دیتا ھے - اکثر باتوں میں مجھے ترکی کی راے عامہ سے کسی قدر اختلاف ھے ' اور یہ چیز کہ میں ترکی کتابوں پر محض ایک ھمدرد غیر ملکی کی حیثیت سے نظر ڈالتا ھوں ' اگر بعض حیثیتوں سے میرے لئے مفید ھے ' تو اکثر حیثیتوں سے غیر مفید بھی ھے ۔ مثلاً خالدہ ادیب خانم کی مثالی صورت نگاری اور ان کے ناھموار طرز ادا کا مجھہ پر کچھہ بہت زیادہ اثر نہیں ھوا ' اور میں ان کی مقبولیت کی وجہ صرف یہ سمجھتا ھوں کہ انھوں نے وطن کی زبردست خدمات انجام دی ھیں ' لیکن اس میں کسی کو شک نہیں ھوسکتا کہ انھوں نے نئی ترکی ذھنیت پیدا کرکے بہت قابل تعریف کام کیا ھے —

یعقوب قادری ' جو نثر منظوم لکھنے میں ایک صاحب فن کی حیثیت رکھتا ھے ' میری نظروں میں بہت کچھہ وقعت ھے ۔ سب سے پہلے اخبار ثروت فنون کے ایک مضمون بہ عنوان " استمداد " میں یعقوب قادری نے اس طرح کی نثر منظوم لکھی ' اس مضمون میں انھوں نے تحریک پاکی زبان کے ان حامیوں پر تنقید کی تھی ' جو زبان کی صفائی کے بارے میں غلو سے کام لیتے ھیں - ان کی پہلی ناول " سرانجام " مصر کی ایک کنیز کی سیدھی

سادی داستان ہے ' لیکن اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف میں جذبات انسانی کی دھوپ چھاؤں دکھانے کی صلاحیت ہے ' اور ان کا دل پرسوز و گداز ہے - ان کی تصنیف ارنلرین باغی (گلشن تقدس) میں زہد خشک کا خاکہ اڑایا گیا ہے ' اور اسی مضمون کو دوبارہ ایک اور ناول نور بابا میں بیان کیا گیا ہے ' جس کا قصہ یہ ہے کہ ایک عقیدت مند عورت ایک بکتاشی درویش سے محبت کرتی ہے ' جو عشق مجازی کے توسط سے عشق حقیقی حاصل کرنا چاہتا ہے - جب عورت کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسے محض ایک اعلیٰ اور شریفانہ مقصد کے حصول کے لئے آلۂ کار کے طور پر استعمال کیا گیا ہے ' تو وہ اپنی قسمت پر شاکر ہوجاتی ہے ' اور درویش کو معاف کرکے طمانیت قلب حاصل کرتی ہے - اس ناول نے ایک اچھا خاصہ ہنگامہ پیدا کردیا ' جانثاریوں کے قلع قمع کے بعد بکتاشیوں کا حلقہ غیر ہردل عزیزبن گیا ' دوسری طرف بعض لوگوں نے ان درویشوں کے مخفی رسوم و عبادات کے اس طرح برملا بیان کرنے کو ایک طرح کی مذہبی جسارت اور سوء ادبی خیال کیا —

رفیق خالد ترکی ظرافت کے ایک قابل نمائندے ہیں - ترکی ظرافت اپنی سادگی کے اعتبار سے ایک اعلیٰ درجہ کی چیز ہوتی ہے اور گزشتہ صدیوں میں بھی جب ترکی ادبیات کا گزر یورپ تک نہیں ہوا تھا ' ایک کتاب ایسی تھی جس نے یورپ کی توجہ کو خاص طور پر جذب کرلیا تھا : یعنی خوجہ نصرالدین کے قصے - اس کتاب کی ظرافت ' اس کے کنائے ' اور اس کے چلتے ہوے فقرے ' جب کبھی پڑھے جائیں گے ہنسی کی گد گدی ضرور پیدا کریں گے - رفیق خالد نے اپنی کتاب کرپنی دیہ کلری (خارپشت کے مقولے) میں خوجہ نصرالدین ہی کو نمونہ بنایا

ھے' اور اپنی تیز زبانی سے نوجوان ترکوں پر حملے کئے ھیں اور سیاسیات میں ان سے جو حماقتیں ھوئیں اس کا مذاق اڑایا ھے - اس نے قدیم مورخ نائمه کی عبارت کی مزاحیه نقل کرکے اسی رنگ میں دستوری حکومت کے خاص خاص افراد' مثلاً احمد رضا' رضا نور وغیرہ کا خاکه اڑایا ھے - ھنسنے ھنسانے کی باتوں' اور خاکه اڑانے کے علاوہ' اس سلسله مضامین میں ھمیں ان ایام کا سارا حزن و ملال بھی جھلکتا نظر آتا ھے' جن سے جمہور ترکی کو بڑی بڑی امیدیں تھیں —

لیکن رفیق خالد صرف اپنی ظرافت ھی کے لئے ممتاز نہیں ھے' بلکه قصه لکھنے کا سلیقه بھی اس میں بہت اچھا ھے - وہ اپنے افراد قصه کے نقش و نگار ایسے مو قلم سے اتارتا ھے که وہ حقیقی بن کر اس کی ناولوں کے صفحات سے مجسم باھر آ جاتے ھیں - اپنی کتاب (اناداولیوناسل گیور دیوم) میں اس نے ایشیاے کوچک کا جو بیان کیا ھے وہ بہت مفصل اور مطابق اصل ھے' لیکن قدرے خشک بھی ھے - ایسا معلوم ھوتا ھے که اس میں ایجابی تخلیقی قوت کے مقابله میں سلبی تنقیدی قوت بہت زیادہ تھی - اس کی استادانه زبان نہایت سلیس اور شیریں ھے' اور ظریفانه استعارات اس میں بھرے ھوے ھیں - ترکی کے سیاسی انقلابات کی وجه سے وہ وطن چھوڑنے پر مجبور ھوا - جب ایک نئی قوم بن رھی ھو' اس حالت میں ایسی تیز اور کاٹ کرنے والی زبان کا بھلا نہیں ھو سکتا - ھمیں امید ھے که اپنے آباءی وطن کی محبت اور آرزو اس کے احساسات میں گہرائی پیدا کرے گی اور اس کی تحریک سے وہ کوئی پائندہ تر ادبی شاھکار پیش کرسکے گا —

ظرافت میں رفیق خالد کا ایک قابل حریف عمر سیف الدین تھا -

وہ فوجی افسر تھا اور ادبیات میں نیا رنگ پیدا کرنے کی تحریک میں وہ پیش پیش تھا - وہ ایک طرف میدان جنگ میں تلوار کے جوہر دکھاتا تھا، تو دوسری طرف اپنے قلم سے مخالفوں کا مقابلہ کرتا تھا - اگرچہ اس کا انتقال بہت قبل از وقت اور کم عمری میں ہوا، تاہم اپنی تصانیف کی بدولت ترکی ادبیات میں وہ زندہ جاوید ہوگیا ہے - اس کے مزاحیہ مختصر افسانے جو "اونچی ایڑی" (پیوسک پیوکچلر) کے عنوان سے شایع ہوے ہیں اس کے لاجواب قدرت فن اور سنجیدہ ظرافت کے ثبوت ہیں اور بہت دنوں تک پڑھے جائیں گے —

خالد ضیا کی ناولوں کے بعد، سب سے زیادہ شہرت رشاد نوری نے حاصل کی، اور در حقیقت وہ اس شہرت اور کامیابی کے مستحق بھی ہیں، اس لئے کہ وہ حقیقی معنوں میں قصہ بیان کرنے میں کمال رکھتے ہیں اور اس کی ناولیں ہر حیثیت سے مغربی ناولوں کی ٹکر کی ہیں - انھوں نے اپنی ادبی زندگی ڈراموں کے نقاد کی حیثیت سے شروع کی، اور یورپ کے ڈراموں کی وسیع معلومات حاصل کرنے کے بعد انھوں نے خود بھی بعض کامیاب ڈرامے لکھے جن سے ان کی قدرت فن ظاہر ہوتی تھی - اس کے بعد انھوں نے مغربی ڈراموں کو "اپنانا" شروع کیا، اور احمد وفیق پاشا کے زمانے سے، جس نے مولی یر کے ناٹکوں کو اپنایا تھا، یہ چیز ترکوں میں بہت مقبول تھی - ڈراموں سے حقیقت میں اور اصناف ادبیات کے مقابلہ میں کہیں زیادہ مالی منفعت ہوتی ہے اور چونکہ ترکی عہد نامہ برن (Berne) میں شریک نہیں ہوا تھا، اس لئے ہر یورپی ناٹک کا بغیر کسی معاوضہ یا حق تصنیف کے ادا کئے ہوے، ترکی میں ترجمہ کیا جا سکتا تھا -

رشاد نوری کی سب سے پہلی ناول "چالی کوشو" تھی جس میں ایک

خود سر لڑکی کا قصہ بیان کیا گیا ہے جو عین شادی کے دن' اپنے منگیتر سے عقد کرنے سے انکار کردیتی ہے' اس لئے کہ اسے یہ خبر مل جاتی ہے کہ شادی سے پہلے یہ شخص کھل کھیل چکا ہے' اس کے بعد وہ ایشیائے کوچک میں ادھر اُدھر گھومتی رہتی ہے جہاں اسے کئی حادثات درپیش آتے ہیں' بالآخر واپس آکر وہ اپنے منگیتر کو معاف کردیتی اور اسی سے شادی کرلیتی ہے - اس ناول کا موضوع' جو چھ سو صفحات میں بیان کیا گیا ہے' سیدھا سادھا ہے' اور فن کی حیثیت سے اس میں کئی خامیاں نکالی جاسکتی ہیں' لیکن اس کے باوجود قصہ اس قدر دلکش اور دلچسپ ہے کہ پڑھنے والا اسے ختم کئے بغیر نہیں رہ سکتا - یہ ناول سرتاپا ترکی ہے اور قارئین نے اسے دل سے پسند کیا ہے - مصنف ہمیشہ کوئی نہ کوئی مثالی واقعہ بیان کرتا ہے جو ناول کے موضوع کی بنیاد ہوتا ہے —

اس کی ایک اور ناول (دو دکتن کلبہ) " از لب تا دل " ہے اور اس میں بھی ایک مرکزی واقعہ ہے جسے ناول میں پھیلا کر پیش کیا گیا ہے - اس کا غم انگیز اور کسی قدر مایوسانہ لب ولہجہ ترکی مزاج کی سچی تصویر ہے' اس لئے کہ یہ فوجی قوم باطن میں غمگین اور ملول ہے اور رقیق جذبات سے متاثر ہوتی ہے - اس میں ایک مغنی اور ایک لڑکی کی داستان حسن و عشق بیان کی گئی ہے - لڑکی' اس وقت سے جب کہ اس کا عاشق پہلا بوسہ محبت لیتا ہے' آخر تک بدنصیبی اور رسوائی کے باوجود اپنی وفا پر مستقل رہتی ہے' لیکن مغنی کو اپنی دنیاوی کامیابی سے کسی قسم کی مسرت حاصل نہیں ہوتی اور وہ اپنی پہلی محبوبہ کی طرف پھر رجوع کرتا ہے' لیکن بہت بعد از وقت - قصہ کی تان خود کشی پر ٹوٹتی ہے —

دیہات کی فضا کا بیان' دلکش انا طولیہ کی لفظی تصویریں' اس کی

بہار کی نگہتیں اور خزاں کی رنگینیاں ' ہیروئن کے کھرے اور سچے جذبات ' انسانی جذبات نفرت و غصہ کا تلاطم - انسانوں کا زندگی کی بھول بھلیاں میں مایوس اور ناکام بھٹکتے پھرنا ' ان سب باتوں کا بیان اتنا تبدیلی ' حقیقی اور ساتھ ھی پر لطف ھے کہ پڑھنے والا بے اختیار تعریف کرتا ھے - سینما کی تصویر بنانے کے لئے یہ قصہ نہایت مناسب اور موزوں ھے - حال میں رشاد نوری کا ایک اور قصہ " دمغہ " (داغی) نکلا ھے ' جس کا ماحصل یہ افسوس ناک حقیقت ھے کہ معاشرتی زندگی میں نمود اور نمائش حقیقت اور صداقت سے زیادہ موثر ھوا کرتی ھے ' اور ھیرو کو ' جس نے اپنی ھر چیز حتی کہ عزت تک کو اپنی محبوبہ کے لئے قربان کردیا ھے ' آخر میں ھر طرف سے ' اور خود معشوقہ کی طرف سے بھی دھتکار ھی ملتی ھے - اس ناول میں انقلاب کے زمانے کا قصہ بیان کیا گیا ھے اور اس سے نو جوان ترکوں کی تحریک ' ان کی امنگوں اور ناکامیوں پر بھی اچھی روشنی پڑتی ھے - اس کے بعض ابواب میں زمانہ جنگ کے مصیبت ناک واقعات کی تصویر بھی دکھائی گئی ھے —

ادھم عزت کی ناول " شادران کاون " (مجنونہ) حقیقی معنوں میں افسانۂ جنگ ھے ' جس میں کمال حقیقت نگاری کے ساتھ ترکی کے مصائب جنگ ' لڑائی کی ناقابل بیان تکلیفیں ' اور اس کی حماقتوں کا ذکر کیا گیا ھے - قصہ یہ ھے کہ ایک ترکی جنرل در دانیال میں داد شجاعت دیتا ھے - لیکن گھر میں ' اس کی بیوی اس سے بے وفائی کرکے اس کے ایڈی کانگ کے ساتھ عشق بازی کرتی ھے - انجام یہ ھوتا ھے کہ پاشا خودکشی کرلیتا ھے ' اور اس کی بیوی ان مجنونانہ عیش پرستیوں اور ھوسناکیوں میں مبتلا ھوجاتی ھے جس نے اختتام جنگ پر قسطنطنیہ کو تہ و بالا کردیا

تھا ' بالآخر کئی حادثات اور معاشقوں کے بعد وہ ادنیٰ ترین کردار پر اتر آتی ہے ' اور پاگل ہوجاتی ہے - اس ناول کا طرز بیان اخباری ناولوں کی طرح سیدھا سادھا ہے ' اور اس میں بہت چھوٹے چھوٹے جملے لکھے گئے ہیں - یہ بھی رشادنوری کی ناولوں کی ایک خصوصیت ہے - البتہ جنگ کے دوران میں قسطنطنیہ کی جو کچھ معاشرتی حالت رہی اس کے متعلق آئندہ یہ کتاب ایک تاریخی ماخذ کا حکم رکھے گی - اس کے علاوہ ادھم عزت نے بعض دلکش مختصر افسانے بھی لکھے ہیں' جن میں ترکی کی موجودہ زمانہ کی بے فکریوں کی سچی تصویر کھینچی ہے —

روشن اشرف کی تصنیف " دیپور لرکی " (" لوگ کہتے ہیں یا " می گویند ") میں ادبی زندگی' اور مصنفین کی سیرت کا سچا سچا حال لکھا گیا ہے' اور اس میں مصنفین سے ان کی تصانیف کے متعلق گفتگو بیان کی گئی ہے' اس کتاب کا طرز تحریر کسی قدر تصنع لئے ہوے ہے' لیکن یہ مصنفوں کا اچھا خاصہ مرقع ہے - ارجمند اکرم نے بھی جو مشہور استاد اکرم کا بیٹا ہے' بعض حقیقت آمیز اور پڑھنے کے قابل ناولیں لکھی ہیں' جو وطن پرستی کے جذبہ سے مملوء ہیں' اور سیرت نگاری کا کمال ان میں پایا جاتا ہے - اس کی ناول کان و ایمان (خون اور ایمان) میں ان ترکی خواتین کی جانبازی اور ایثار کو دکھایا گیا ہے جنھوں نے اپنے بہادر شوہروں کے دوش بدوش مصطفیٰ کمال کے جھنڈے کے نیچے لڑکر حق رفاقت ادا کیا - اس کی ناول " گیون بترکن " (قریب غروب) ایک معاشرتی افسانہ ہے' جس میں استادانہ انداز سے یونانیوں کی زندگی اور ایماندار اور راست کردار مسلمانوں پر ان کے طرز عمل کے پست کن اثرات کو بیان کیا گیا ہے اور اس دلخراش واقعہ کی تفصیل دی گئی ہے - اس میں ایک اخلاقی

سبق بھی دیا گیا ہے - مسلمان ہیرو جو فلاکت زدہ، سفلہ مزاج اور غدار ہوگیا تھا، سنبھل جاتا ہے، اور پھر حب وطن کی قدیمی روایات پر مستقل ہو جاتا ہے، اور اپنی بیوی کے پاس واپس آکر از سر نو نیکی اور سچائی کی زندگی بسر کرتا ہے - زمانہ جنگ میں قسطنطنیہ کی حالت، دونوں ہاتھوں سے لوگوں کو لوٹنے والے سوداگروں کی دنایت، سڑکوں پر فاقہ زدہ بچوں کا پڑا رہنا، زخمیوں کے اترے ہوے چہرے اور دھنسی ہوئی آنکھیں، —— ان سب چیزوں کے نقش اس نے کچھ ایسے حقیقت نگاری کے مو قلم سے اتارے ہیں کہ اس ناول کی حیثیت آئندہ ایک تاریخی ماخذ کی سی ہو جاے گی - یہ ناول یقیناً کان و ایمان سے بڑھی ہوئی ہے - اس کی ایک کتاب اولیاے جدید ہے، جو اولیاے چلبی کے سیاحت نامے کی مزاحیہ نقل ہے، اس کا منظر قسطنطنیہ ہے، اور اس میں نئی نئی اختراعات اور بود و باش کے نئے نئے طریقوں کا خاکہ اڑایا گیا ہے ——

ترکی ادبیات کے دور جدید میں نئے شاعر بھی پیدا ہوے ہیں - ان میں ہماری راے میں اولیت کا شرف رضا توفیق کو حاصل ہے جو بہ حیثیت فلسفی، مورخ، سیاست داں اور اعلیٰ تعلیم و تہذیب یافتہ شخص کے شاعری کے میدان کا دھنی ہے اور اس کی شہرت پائدار ثابت ہوگی - وہ ترکی میں اپنے زمانہ کا جید ترین عالم تسلیم کیا جاتا تھا، اور فن خطابت میں تو وہ لا جواب تھا - یورپی السنہ اور ادبیات کی جو گہری واقفیت اسے تھی، اس کے اعتبار سے وہ عالمانہ زندگی کے لئے نہایت موزوں تھا، لیکن سیاسی انقلابات نے اس میں خلل ڈال دیا - اس نے یکتا شیون کے گیتوں کے حسن کو اچھی طرح سے سمجھہ لیا تھا اور انھی کے رنگ میں، بزم جم کے عنوان سے اس نے کئی رندانہ گیت لکھے ہیں، جن میں اپنے فطری رنگ تغزل کو دکھانے کا اسے خوب موقع ملا ہے ——

مذہبی احساسات کو نظم کا جامہ پہنانے والا محمد عاقف تھا، جو شاعر ہونے کے علاوہ واعظ اور عمرانیات پر بعض کتابوں کا مصنف بھی ہے۔ وہ گلی کوچوں کے قہوہ خانوں میں جاکر وہاں کے بے فکروں سے گفتگو کیا کرتا تھا۔ اس نے آوارہ گردوں اور خانہ بدوشوں کی زبان سے ان کے قصے سنے ہیں۔ اس کے حساس دل و دماغ پر ان مفلوک الحال اور ادنیٰ درجہ کے لوگوں کے مصائب اور آلام کا بہت گہرا اثر پڑا، اور اس نے گویا اپنے موسیقیت سے بھرے ہوے اور پر تاثیر اشعار میں ان کی دل ہلا دینے والی فریاد کے چربے اتار کر رکھدئے ہیں۔ اس کو ترکی معاشرت کی اصلاح کی دھن تھی، وہ چاہتا تھا کہ ترکوں میں ان کی خامیوں اور پستیوں کا احساس پیدا کردے۔ حسین رحمی نے جو خدمت اپنی ناولوں کے ذریعہ، احمد راسم نے اپنے مضامین سے اور ایک جری ناشر کتب ابراہیم حلمی نے اپنی کتابوں کی مدد سے انجام دی وہی کام عاقف نے اپنی شاعری کے ذریعہ کیا۔ اس نے قومی تحریک کے خلاف اس حیثیت سے کہ وہ اسلام خواہی کی تحریک کے منافی تھی، نہایت گہرے مذہبی احساسات کے ساتھہ اور پاکیزہ ترکی زبان میں مضامین لکھے ہیں۔ اس نے کمال جسارت کے ساتھہ اور علی الاعلان اپنے اشعار میں ترکوں کے زوال کا ماتم کیا ہے، اور اس کی علت فائی احکام مذہب سے بیگانگی اور سچے جذبات ایمانی سے انحراف کو قرار دیا ہے۔ اگرچہ اس کے دلائل نقار خانے میں طوطی کی آواز ثابت ہوے، تاہم اس کی شاعری نے قارئین کے قلوب کو ضرور مسخر اور مسحور کیا اور خان سیفی نے بھی، دوسرے جدت پسندوں کی طرح، قدیم عروض کو چھوڑ کر، محمد امین کی طرح بول گننے کا طریقہ اختیار کیا، لیکن اگر پہلے یہ ساز اک تارہ تھا، تو اب ساز صدرنگ بن گیا، جذبات وہی

پرانے تھے ' لیکن الفاظ اور طرز ادا نئی اور دلکش تھی - اس کی کتاب " گیونیواون سسلر " (دل کی آوازیں) آج ترکی شاعری میں ایک قابل تقلید نمونہ سمجھی جاتی ہے —

یوسف ضیا نے ' جو ایک نہایت قابل اور پرگو شاعر تھا ' لڑائی کے متعلق نظمیں لکھیں ' جن میں زمانۂ جنگ کی تصویریں کھینچی گئی ہیں - اس کی نظمیں " اکندن اکینہ " (طوفان پر طوفان) " شاعرن دعاسی " (شاعر کی دعا) پرجوش اور وطن پرستی کے جذبات سے لبریز ہیں - اس نے منظوم ڈرامے بھی تصنیف کئے ہیں - اس کی زبان اگرچہ الجھی ہوئی ہوتی ہے ' لیکن مطالب میں کسی قسم کا گنجلک نہیں ہوتا - انیس بیہج کی نظموں میں ہمیں ترکی زبان کی موسیقیت کا تموج نظر آتا ہے - " ترک اوجاغی " کے جلسہ میں اس نے جس درد بھرے انداز سے اپنی نظم " سواری لر " (سوار) سنائی تھی اس کی گونج میرے کانوں میں آج تک باقی ہے ' یہ نظم جذبات کی گرمی ' جوش اور موسیقیت سے بھری ہوئی ہے - بیہج کی شاعری میں رقیبت پسندی کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا —

عالی جانب نے رنگ تغزل چھوڑ کر ' فرانسیسی ادبیات کا رنگ اختیار کرلیا ہے - خالد فخری ترکی کا یاسیہ شاعر ہے - فاروق نافذ نے بول گننے میں کمال حاصل کیا ہے ' فرانسیسی عروض کے متعلق اس کی واقفیت بہت گہری ہے اور وہ اپنے موضوع کے مناسب حال بحروں کا استعمال خوب کرتا ہے - ناظم حکمت ترکی سے روس کی طرف فرار ہوگیا ہے ' اب وہ بالشویک ہے اور کسی فرضی نام سے ترکی رسالوں میں اپنی نظمیں بھیجتا رہتا ہے - ان نظموں کی بحریں غیر معمولی طور پر چھوٹی ہوتی ہیں اور اکثر تو ایک پورے مصرعہ میں صرف ایک لفظ ہی ہوتا ہے ' تاہم یہ فجائیہ طرز

بھی حسن سے خالی نہیں ھے —

ترکی کی ادبیات شعر، خواہ آج کل اس کے اوزان، اصناف اور موضوع دوسرے ھوگئے ھوں، پھر بھی کئی حیثیتوں سے قدیم شعر و شاعری کا ایک سلسلہ ھی ھے، لیکن تمثیلی ادبیات، ڈراما وغیرہ اسلامی ممالک میں ابھی بہت قریبی زمانے سے نظر آنے لگی ھے - ترکی کی عامیانہ ادبیات میں " اورتا اوینو " بہت قدیم زمانے سے نظر آتے ھیں جو یونانیوں اور چینی ناٹکوں سے لئے گئے تھے، لیکن ان تماشوں کو صرف مرد ھی دیکھ سکتے تھے اور ان کی زبان کرخت، لیکن خالص ترکی ھوا کرتی تھی، اس لئے کہ وہ جہلاء کے لئے لکھے جاتے تھے - آج کل کا ترکی ڈراما اس قدیم ڈرامے کی ترقی یافتہ شکل نہیں ھے بلکہ اس میں یورپی ناٹکوں کو ترکی رنگ میں پیش کیا جاتا ھے - اس حیثیت سے جدید ترکی ڈراما ایک غیر ملکی چیز ھے، اور عورتوں کے پارٹ نہ کرنے کی وجہ سے اس کی حیثیت ابھی قومی نہیں ھوئی ھے - کمال اور عبدالحق حامد کے ڈرامے کھیلے جانے کے لئے موزوں نہیں ھیں - پس سب سے آسان صورت یہی تھی کہ فرانسیسی ناٹکوں کو ترکی ماحول میں پیش کیا جاے - اسی سے رفتہ رفتہ اصل اور اوریجنل ڈرامے لکھنے کا خیال ترکوں میں پیدا ھوا - ترکی معاشرت کے احیاء پر ترکی اسٹیج کا اثر اندازہ بہت زیادہ پڑنے والا ھے، اس لئے کہ اور کوئی صنف ادبیات اجتماعی حیثیت سے جمہور پر اتنا زیادہ اثر نہیں ڈال سکتی جتنا کہ ناٹکوں کا ھوتا ھے - لیکن اس میں ادبی اھمیت اسی وقت پیدا ھوسکتی ھے جب کہ پہلے ایکٹروں اور منیجروں کی ایک پود تیار ھوجاے اور ناٹک میں فن کی حیثیت پیدا ھوجاے - ترکی ڈراموں میں ابھی ان چیزوں کی کمی ھے - سلطان عبدالحمید کے زمانے میں کسی

ناٹک کے کھیلے جانے کی اجازت نہ تھی اور اسی لئے کسی مصنف نے اسٹیج کے خیال سے ڈرامے تصنیف نہیں کئے - دور جدید کے آغاز سے ترکی ڈرامے نے بھی اپنی نئی زندگی شروع کی ہے، اور اگرچہ زیادہ تر ناٹک غیر زبانوں سے ماخوذ ہیں، تاہم کچھ اوریجنل ڈرامے بھی آج کل کھیلے جاتے ہیں، اگرچہ اب تک ان میں کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی ہے —

ڈرامے کے فن سے ملتا جلتا خطابت کا فن ہے - تاریخ اسلام کی طرح، ترکی تاریخ میں بھی فن خطابت زیادہ تر مذہب کا آفریدہ تھا - آنحضرت صلعم کے خطبہ عرفات سے آج تک ہزاروں مسجدوں میں ہر جمعہ کو جماعتیں خطبے سنتی ہیں - تاریخ اسلام کی پہلی صدی میں ان خطبوں میں پرزور، فصیح، اور مدلل بحثیں کی جاتی تھیں، لیکن بعد کو ان پر حالت جمود طاری ہوگئی اور ان کی خصوصیت امتیازی غائب ہوگئی - ترکی میں ویسے تو بعض سلاطین اور قائدین وقت فوج یا باغی جانثاریوں کے سامنے تقریریں کرتے تھے، یا بعض درویش آج کل کے زعماء کے رنگ کی تقریریں کیا کرتے تھے، لیکن اصل میں فن خطابت مشرق میں دستوری حکومت کے ساتھ داخل ہوا، اور انقلاب کے زمانوں میں "سوقیانہ" مقرروں کو جادو بیانی کے خوب موقع ملے - ترکوں کے تیز اور بے چین مزاجوں کو یہ نئی صنف ادبیات بہت کچھ پسند آئی اور بعض بلند پایہ خطیب مثلاً عمر ناجی اور حمداللہ صبحی اور آج کل کے زمانے میں صدر جمہوریہ ترکی غازی مصطفیٰ کمال پاشا پیدا ہوے، جن کی تقریر مسلسل پانچ روز تک جاری رہی اور اس میں انھوں نے انقلاب اور اس کے بعد کی فوجی کامیابیوں کی مکمل تاریخ بیان کر دی تھی، یہ تقریر فن خطابت میں ایک بالکل نئی چیز ہے —

ایک اور جدید اور تیزی سے ترقی کرنے والی صنف ادبیات ظریفانہ صحافت ہے جس کے نمونے ترکی کے ظریفانہ رسالوں اور اخباروں میں آج کل نظر آتے ہیں، اور جن میں آج کل کی زندگی کے مضحکہ خیز اجزا کو دکھایا جاتا ہے، اس صنف ادبیات کی طرف سے آئندہ کامیابی کی بڑی بڑی امیدیں ہیں، اس لئے کہ ترکی مزاج اس کے لئے خاص طور پر موزوں ہے —

لیکن سب سے زیادہ ترقی کے آثار ہمیں ترکی علمیت میں نظر آتے ہیں۔ ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ آج سے پچاس سال پہلے ترکی میں علمیت کا فقدان تھا، اور کوئی ترکی تاریخ یا تاریخ ادبی، یا تاریخ مذہبی یا سوانح عمری علمی اصولوں پر نہیں لکھی گئی تھی۔ تاریخ کی کتابیں زیادہ تر تالیفات ہوا کرتی تھیں اور ان میں کسی قسم کی سنجیدہ اور وقیع تحقیق نظر نہ آتی تھی۔ لیکن انجمن تاریخ کے قیام کے بعد سے یہ حالت بدل گئی۔ نجیب عاصم جیسے علماء نے جنہیں یورپی لسانیات پر عبور حاصل تھا، ترکوں کی قدیم تاریخ کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں پیش کیا۔ نجیب عاصم کی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ آج کل اس صنف میں ترکوں نے کس قدر ترقی کرلی ہے۔ عثمانی شاہیت یا عہد سلاطین کے بہترین مورخ احمد رفیق ہیں، جنہوں نے قدیم مآخذ کی تلاش اور تحقیق کی ہے اور ترکی تاریخ کے مخصوص دوروں کے متعلق تصنیفیں کی ہیں، تاریخ تمدن پر روشنی ڈالنے والے کاغذات اور ماخذ کے علمی اصولوں پر طباعت احمد رفیق ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے —

تاریخ ادبیات کا کام سب سے پہلے عبدالحلیم ممدوح نے اپنی ایک مختصر تصنیف سے شروع کیا، جن میں تاریخی حالات کے علاوہ قارئین کے

لئے کچھ انتخابات کلام بھی شریک کئے گئے تھے - جدید مصنفین کی جدت
پسندیوں پر جو تنقیدیں ہوئیں ان کی وجہ سے بھی ادبیات پر کئی کتابیں
لکھی گئیں - یہ کتابیں ان پرانے تذکروں سے بہت مختلف تھیں جن
میں صرف چند سطروں میں شاعر کا حال اور اس کی تصانیف کا ذکر
کردیا جاتا تھا - جو ترک طلبہ فرانس میں زیر تعلیم تھے - وہ جب اپنے
وطن واپس آئے تو انھوں نے بہت جوش و خروش سے کام شروع کیا اور
جمالیاتی (Aesthetie) نقطہ نگاہ سے ترکی تصانیف پر تنقیدیں لکھیں - ان
سے بحث و مباحثہ کا جو بازار گرم ہوا ' وہ ادبی حیثیت سے بہت کچھ
نتیجہ خیز اور بار آور ثابت ہوا - علی کمال نے اپنی تصنیف " ادبیات
حقیقیہ " میں یہ بحث کی ہے کہ ادبی تصانیف میں حقیقت اور تخیل کی
آمیزش ضروری ہے ' اور ادبیات کو انسانی زندگی کے ہر پہلو کا آئینہ ہونا
چاہیے - اس نے ترکی مصنفوں پر یہ اعتراض کیا ہے کہ وہ صرف اپنے تخیل
کے غلام بن گئے ہیں اور انکا مدعا صرف چیدہ چیدہ نمونوں کی نقل اُتارنا رہا
ہے - اس نے ترکی ادبیات پر بہت سخت تنقیدیں کی ہیں اور اسے صرف
مہمل اور بے معنی قوافی کا مجموعہ کہا ہے —

رئیف نجدت کی تصنیفیں " حسر و فکرلر " (حسیات و افکار)
اور " حیات ادبیہ " ایک سلسلہ مضامین ہیں ' ان مقالات میں مصنف
نے یورپی مذہب ادبیات کی حمایت کی ہے اور اس پر زور دیا ہے
کہ ادبیات میں معاشرتی رجحانات کا دخل ضرور ہونا چاہئے اور زمانۂ
قدیم کی طرح اسے محض " فن لطیف " نہیں ہونا چاہئے - وہ روسو اور
ٹالسٹائے کے مداح ہیں ' ان کا خیال ہے کے ادبیات کو جمہور کا مدرسہ سمجھنا
چاہئے اور مصنفوں کو اخلاقی نصب‌العین پیش نظر رکھنا چاہئے - ترکی کی

غزلیه شاعری کے متعلق ان کی راے ھے کہ اس میں کوئی خوبی نہیں پائی جاتی —

حسین جاھد بھی جدید یورپی مذھب ادبیات کے پر جوش حامی ھیں انھوں نے " گو گلارم " (میری جد و جہد) کے عنوانات سے تنقیدی مقالات کا ایک سلسلہ شایع کیا ھے - وہ ایک نہایت بلند پایہ نقاد ھیں ' اگرچہ ان کی تنقیدیں کہیں کہیں بہت سخت ھو جاتی ھیں ' انھوں نے علی کمال اور دوسرے مصنفوں پر حملے کئے ھیں - وہ ادبیات میں عربی رنگ کے سخت مخالف ھیں اور ان کا خیال ھے کے آج کل کے لحاظ سے عربی اور فارسی تہذیبوں میں مطلق جان نہیں پائی جاتی —

جن مصنفین نے نئی ترکی زبان (جسے پست اور زوال پذیر کہا جاتا ھے) لکھی ھے ' ان کے وہ مدام ھیں اور احمد مدحت ناول نویس اور سامی ماھر لسانیات ' یہہ دونوں بھی اس بارے میں ان کے ھم خیال ھیں - انھوں نے ترکی ھجاء سے بحث کی ھے اور اس پر زور دیا ھے کے صوتی تحریر کے اصولوں پر عربی حروف تہجی میں اصلاح کرنی چاھئے لیکن اس بارے میں وہ پھر بھی انور پاشا سے پیچھے ھیں جنھوں نے سالم اور منفرد حروف سے الفاظ بنانے کا ایک نیا ھی طریقہ نکالا تھا —

ان مقالات اور تصانیف سے معلوم ھوتا ھے ترکی جمہور کو ادبی تنقید میں کتنی دلچسپی تھی ' اور اگرچہ آج بھی کتب فروشوں کی الماریوں میں ھمیں بکثرت ادنیٰ درجہ کی اور بد مذاقی سے لکھی ھوئی ناولوں اور قصوں کا انبار نظر آتا ھے ' لیکن اب فنی اور ادبی علوم سے ترکوں کو روز بروز زیادہ شغف ھوتا جاتا ھے —

ادبیات کی علمی اصولوں پر تحقیق سب سے پہلے برو سلی محمد طاھر نے شروع کی ' ان کی تصنیف " عثمان لی مولف لری " (عثمانی مصنفین)

سے ' قدیم مصنفین کے متعلق ان کی وسیع معلومات کا اندازہ ہوتا ہے -
وہ ایک بلند پایہ عالم تھے - اور انہوں نے بہت جلد ادبی تنقید کا ایک
خاص نہج ڈال دیا اور اہم تحقیقی کام کیا - کپرو پرولیو زادہ محمد اد
نے ' جو ایک امیر خاندان کے رکن تھے ' متعدد قابل قدر کتابیں لکھی
ہیں ' مثلاً " یوکیونیکو ادبیات " (ادبیات جدید) ' جس میں انہوں
نے ترقی پسند جماعت کی تائید کی ہے ' علی ہذا انہوں نے ترکی تصوف
کے پرانے آثار بڑی ڈھونڈھ نکالے اور اسے ایک نہایت ہی دقیق النظر ' اور
عالمانہ کتاب " تورک ادبیات الک متصوفلر " (ترکی ادبیات کے اولین
متصوفین) میں پیش کیا - اس کے علاوہ انہوں نے ترکی کی بعض کلاسک
کتابیں بھی اپنے بیش قدر حواشی کے ساتھ مرتب کیں '

اسمعیل حبیب کی زبردست تصنیف " ترک تجدد ادبیات تا رخی "
(تجدد ادبیات ترکی) اپنے طرز کی پہلی باقاعدہ اور تنقیدی تصنیف ہے
جس میں متعدد نمونوں اور حواشی کے ساتھ گزشتہ صدی کے ترکی ادب
کی تنقیدی تاریخ بیان کی گئی ہے - ان کی فاضلانہ تشریح و توضیح و
ترتیب سواد سے میں نے بھی بہت کچھ استفادہ کیا ہے - دینیات کے
شعبہ کے متعلق اتنا ہی کہدینا کافی ہے کہ جب سے قدیم مدرسوں کی
تعلیم کے بجائے جامعات کی منضبط تعلیم کا رواج ہوا ہے ' اس شعبہ میں
بھی بہت کچھ ترقیاں ہوئی ہیں - تاریخ فنون میں بھی نئی ترقی نظر
آتی ہے ' اور اس کے آثار بہت اچھے نظر آرہے ہیں - جلال اسد کی تصنیف
" تورک صنعتی " (ترکوں کے فنون) اس کی مثال ہے —

سیاسی اور معاشرتی اصلاحات کے بعد سے ' اصول قانون ' سیاسیات
اور معاشیات کے شعبوں میں بھی قابل تعریف ترقی اور اضافہ ہوا ہے '

اور عصر حاضر کے ترکی ادبیات کے ذخیرہ میں آج ہمیں ہر جدید علم پر ترکی مصنفین کی تصنیفیں نظر آتی ہیں —

دنیا نے اس خبر کو بہت حیرت کے ساتھ سنا تھا کہ ترکی رسم الخط میں بھی اصلاحات ہوئی تھیں اور عربی حروف کی بجاے لاطینی حروف کا استعمال شروع ہوا ہے یہ بدعت موجودہ زمانہ کے ترکی رجحانات کا عین اقتضاء ہیں - اس میں شک نہیں کہ ابتداء میں اس تبدیلی نے سب کو حیرت میں ڈال دیا تھا ' لیکن آج کل وہ بغیر کسی رکاوٹ کے کام دے رہی ہے ' اور اگرچہ اس کی وجہ سے نئی پود کو قدیم ادبیات کی واقفیت نہ ہوسکے گی اور آئندہ نسلوں کے لئے پرانے ادب کی لطافتیں ناقابل فہم ہوجائیں گی تاہم نئے ادب کے نشو ونما میں اس سے کسی قسم کا خلل نہیں پڑے گا ' صرف شرط یہ ہے کہ بلند پایہ مصنفین پیدا ہوتے رہیں - اتنا بہرحال یقینی ہے کہ اصلاح رسم الخط سے ترکی تہذیب و تمدن کی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے —

تاریخ ادبیات ترکی کے اس خلاصہ کو میں بغیر اس امر کا اظہار کئیے ہوے ختم نہیں کرسکتا کہ ادب صرف مصنفین ہی کی وجہ سے پیدا نہیں ہوتا ' اس ادب کی پڑھنے والی جمہور اور پبلک ہوتی ہے ' جو اسے مختلف طریقوں سے پڑھتی ہے - قارئین کی سند قبولیت اگر نہ ہو ' تو مصنفین کی ذہانت اور ذکاوت سب نقش برآب ثابت ہوتی ہے - ہماری یہ آرزو اور دعا ہے کہ خدا کرے کہ پرانے مشاہیر مصنفین ترکی کی روایات سے پوری قوم میں ایک ایسی نئی اور اعلیٰ روح پیدا ہوجاے جو ایک قومی ترکی تہذیب و تمدن کی تشکیل مضبوط بنیادوں پر کردے —

———)‡o‡(———

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن

اپنے ان مہربان اصحاب کی فہرست مرتب کر رہی ہے جو اس بات کی عام اجازت دیدیں کہ آئندہ جو کتاب انجمن سے شائع ہو وہ بغیر ان سے دوبارہ دریافت کئے، تیار ہوتے ہی ان کی خدمت میں بذریعہ وی پی روانہ کردی جایا کرے۔ ہمیں امید ہے کہ قدردانان زبان اردو ہمیں عام طور پر اس کی اجازت دیدیں گے کہ ان کے اسمائے گرامی اس فہرست میں درج کرلئے جائیں اور انجمن سے جو نئی کتاب شائع ہو، فوراً بغیر دریافت کئے روانہ کردی جایا کرے۔ یہ انجمن کی بہت بڑی مدد ہوگی اور آئندہ اسے نئی نئی کتابوں کے طبع کرنے میں بڑی سہولت ہوجائے گی۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے وہ معاونین جو اردو کی ترقی کے دل سے بہی خواہ ہیں، اس اعانت کے دینے میں دریغ نہ فرمائیں گے —

ایسے اصحاب انجمن کے رکن سمجھے جائیں گے اور ان کی خدمت میں کل کتابیں جو آئندہ شائع ہوں گی وقتاً فوقتاً چوتھائی قیمت کم کرکے روانہ ہوں گی —

المشتہر

انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)

اردو

یہ انجمن کا سہ ماہی رسالہ ہے جس میں ادب اور زبان کے ہر پہلو پر بحث کی جاتی ہے اور محققانہ اور تنقیدی مضامین درج ہوتے ہیں ہندوستان بھر میں یہی ایک خالص ادبی رسالہ ہے جو اس اہم خدمت کو خاص حیثیت سے انجام دے رہا ہے - اردو مطبوعات اور رسالوں پر اس کے تبصرے امتیازی شان رکھتے ہیں۔

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک سات روپے سکۂ انگریزی
[آٹھ روپے سکۂ عثمانیہ]

---*---

سائنس

انجمن ترقی اردو کا سہ ماہی رسالہ

جس کا مقصد یہ ہے کہ سائنس کے مسائل اور خیالات کو اردو داں میں مقبول کیا جائے۔ دنیا میں سائنس کے متعلق جو نئی نئی بحثیں یا ایجادیں اور اختراعیں ہو رہی ہیں یا جو جدید انکشافات وقتاً فوقتاً ہوں گے ' ان کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا جائے - ان تمام مسائل کو حتی الامکان صاف اور سلیس زبان میں بیان کرنے کی کوشش کی جائے گی ۔ اس سے اردو زبان کی ترقی اور اہل وطن کے خیالات میں روشنی اور وسعت پیدا کرنا مقصود ہے —

سالانہ چندہ آٹھ روپے سکۂ انگریزی (نو روپے چار آنے سکۂ عثمانیہ)

امید ہے کہ اردو زبان کے بہی خواہ اور علم کے شائق اس کی سرپرستی فرمائیں گے —

المشتہر
انجمن ترقی اردو اورنگ آباد (دکن)